صفر المظفر۔ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ
اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۹ء

سہ ماہی

حکمت قرآن

لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

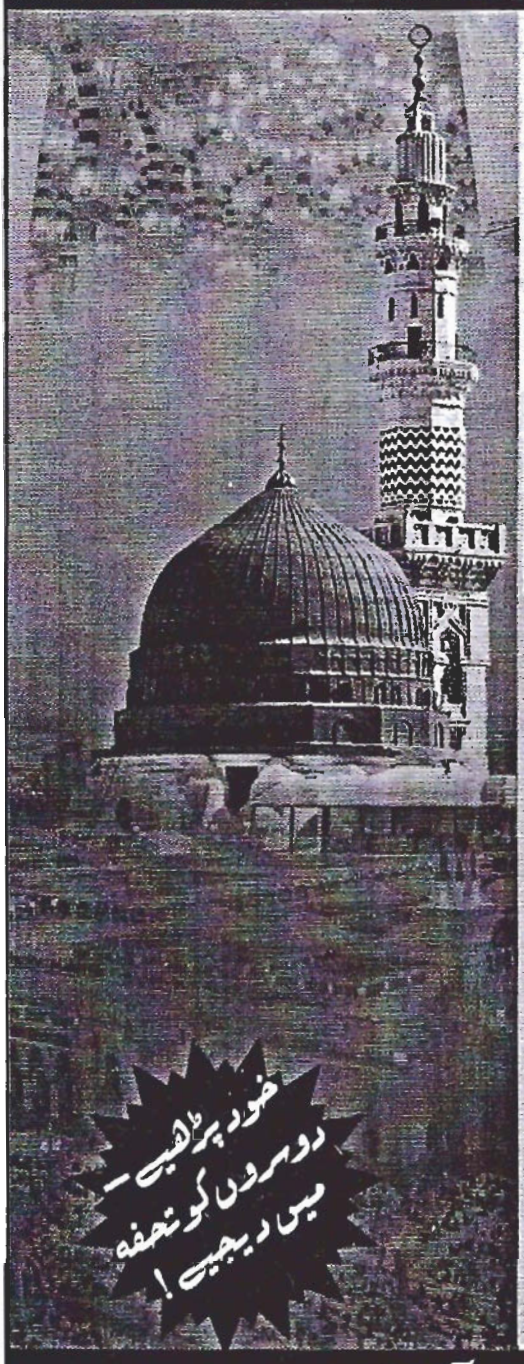

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیے۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۲۸ شمارہ ۴

صفر المظفر۔ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۹ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۔ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہما اللہ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 280 روپے، فی شمارہ: 70 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

''مدرسہ ڈسکورسز'' کا سیلابِ بلاخیز	ڈاکٹر ابصار احمد	3

پیش رفت

امتناعِ سود کا مقدمہ اور اس سے متعلق اُمور کا تعاقب	ادارہ	15

تذکّر و تدبّر

مِلاكُ التأويل (۱۹)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	17

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	30

دانشِ حاضر

برصغیر میں اسلامی نظریۂ حیات کی تشکیل.....	محمد رشید ارشد۔ اویس شوکت	40

فکر و نظر

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ (۴)	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	59

کتاب نُما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	76

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''مدرسہ ڈسکورسز'' کا سیلابِ بلاخیز

ڈاکٹر ابصار احمد

مدرسہ ڈسکورسز کے فکر اور پراجیکٹ کا نقطہ آغاز جناب پروفیسر ابراہیم موسیٰ کی تصنیف "What is a Madrasa?" بنی جو ۲۰۱۵ء میں یونیورسٹی نارتھ کیرولینا پریس سے شائع ہوئی۔ جلد ہی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل مولانا ڈاکٹر وارث متین مظہری نے اس کا اردو ترجمہ ''دینی مدارس: عصری معنویت اور جدید تقاضے'' ۳۳۹ صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع کیا' جو برصغیر کے پڑھے لکھے دینی مزاج کے حامل اصحاب کے مطالعے میں آئی۔ راقم کے پاس اصل انگریزی کتاب ایک دوست کے توسّط سے پہنچی اور اس کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب کی حد تک پروفیسر ابراہیم موسیٰ کے افکار دینی مدارس کے حوالے سے خاصے مثبت نظر آئے۔ اس میں انہوں نے جہاں ایک طرف مغربی اسلاموفوبیا کے تحت پھیلایا جانے والا یہ عام پروپیگنڈا کہ عالَمِ اسلام کے دینی مدارس تشدد پسند' عسکری' تخریب کاروں کی تیاری کے مراکز ہیں' کی سختی سے نفی کی۔ دوسری جانب اس خواہش کا اظہار کیا کہ دینی مدارس کے نصابات کو upgrade کر کے انہیں زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے جس سے طلبائے مدارس کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ ہم عصر چیلنجوں کا جواب دینے کی صلاحیت حاصل کر سکیں۔ لیکن ان کا عزم اور خیال تھا کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم کی روح متاثر نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے فکری جدت و تازگی کے ساتھ ساتھ دینی تعلیمات و مسلّمات کی روح اور حقیقی مفاہیم کو intact رکھنے کا عندیہ دیا تھا۔

بدقسمتی سے چار سال کے دوران ۲۰۱۹ء میں یہ پورا پروجیکٹ ایک مختلف ڈگر پر آگے بڑھتا ہوا صریحاً اسلام مخالف فکری اور تہذیبی یلغار کی صورت اختیار کر گیا اور اس میں پیش کیے گئے اکثر زعماء اور ان کے تعلیمی پروگراموں کے شرکاء کے خیالات تجدید اور تجدّد کے درمیان خط فاصل کو مٹاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ قبل ازیں حکمت قرآن کے شمارہ بابت اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ء کے حرفِ اوّل بعنوان ''دینِ حق اور جدیدیت گزیدہ ذہن و رویّہ'' میں بھی راقم نے عرض کیا تھا کہ دینی فکر کو جدید ذہن کے لیے قابلِ فہم بنانے کے لیے بہت سے افراد اور ادارے کوششیں کر رہے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر مساعی افراط و تفریط کا شکار ہو کر قرآن و سنت پر مبنی اسلام کی متواتر اور اصیل و روایتی و انقلابی تفہیم کی بجائے اپنی تعبیرات میں سیکولر اور لبرل ہیومنسٹ افکار کے اثرات

کے شکار ہیں۔ ''مدرسہ ڈسکورس'' کی دو اہم ترین اور نمایاں شخصیات پروفیسر ابراہیم موسیٰ اور ڈاکٹر مہان مرزا ہیں جو پاکستان، بھارت اور کچھ دوسرے مسلمان ممالک کے روایتی مدارس اور دارالعلوم کے اساتذہ، فارغ التحصیل فضلاء اور زیر تعلیم طلبہ اور طالبات کے ساتھ علمی تبادلہ خیال (مکالمہ) اور تدریسی لیکچرز اور افہام وتفہیم کے ذریعے مذہبی اور کلچرل تکثیریت (pluralism) اور جدیدیت کے لیے ذہناً تیار کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اپنے اس پورے پروجیکٹ کو ان حضرات نے ''Contending modernities'' کا ذیلی نام دیا ہے۔ یعنی جدیدیت کی بھی صرف کوئی ایک قسم نہیں ہے بلکہ اس کی متعدد اشکال اور تشکیلات ہیں جو مسلمانوں کے قدیم روایتی مسالک سے برسر پیکار ہیں، اور مین سٹریم اسلام میں آگے بڑھنے اور مسابقت کے لیے کوشاں ہیں۔ آغاز ہی میں انہوں نے مدرسہ ڈسکورسز کے سلسلے میں تین سال کے تعلیمی وتربیتی پروگرام کا اعلان کیا تھا۔ اس تعلیمی پروگرام میں مذکورہ بالا دو امریکی پروفیسروں کے علاوہ پاکستان سے لیڈ فیکلٹی ڈاکٹر عمار خان ناصر اور بھارت سے لیڈ فیکلٹی ڈاکٹر وارث متین مظہری ہیں، جنہوں نے پندرہ بیس دوسرے چنیدہ فضلاء کے ساتھ مل کر نوجوان طلبہ اور طالبات کی ذہن سازی کا کام سرانجام دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ ڈسکورسز (MD) کے منتظمین کے پاس فنڈز کی کمی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پاکستان، بھارت، نیپال اور قطر میں اپنے پروگرام منعقد کیے اور کلاس ورک، لیکچرز اور بحث وتمحیص کے ساتھ ساتھ شرکاء کے لیے سیاحت اور مقامی لوگوں سے سوشلائزیشن کے مواقع بھی بہم پہنچائے۔ اوپر بیان کردہ چار حضرات کے علاوہ متعدد دوسرے ممالک کے مسلمان اور غیر مسلم سکالرز نے بھی طلبہ کو مختلف موضوعات پر پریزنٹیشنز دیں۔ سمسٹرز کے ساتھ ساتھ تربیتی ورکشاپس اور سمر انٹنسو (summer intensive) ۱۸۔۲۰۱۷ء اور ونٹر انٹنسو ۲۰۱۹ء کا بھی انعقاد کیا گیا۔ انٹرنیٹ پر مدرسہ ڈسکورسز پاکستان کے عنوان سے ایک مفصّل ہینڈ بک اپ لوڈ کی گئی جس میں شرکاء کا تعارف، تصاویر اور سرگرمیوں کی روئیداد (۲۰۱۹۔۲۰۱۷ء)، مدرسہ ڈسکورس (MD) کا پس منظر اور اہداف ومقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ مزید برآں ان حضرات نے اسلامی فکری روایت کی عصری تشکیل کے لیے علمی مباحثات کے شش ماہی اردو ویب جرنل ''تجدید'' کا آغاز کیا ہے جس کا پہلا شمارہ (جنوری۔ جون ۲۰۱۹ء) انسٹیٹیوٹ آف ریلیجس اینڈ سوشل تھاٹ، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی، انڈیا کی طرف سے ویب پر ڈالا جا چکا ہے۔ اس کے سرپرست پروفیسر ابراہیم موسیٰ اور مدیر اعزازی پروفیسر مہان مرزا ہیں جبکہ مدیر مسئول ڈاکٹر وارث مظہری اور معاون مدیر ڈاکٹر عمار خان ناصر ہیں۔ اس جرنل کی مجلس مشاورت میں ڈاکٹر سعدیہ یعقوب (ولمیس کالج) اور ڈاکٹر علی میاں (سیٹل یونیورسٹی) اور برطانیہ سے لندن یونیورسٹی کے ادارے (سکول آف اورینٹل اینڈ افریکن سٹڈیز SOAS) کے ڈاکٹر عدیل کے نام دیے گئے ہیں۔ بلاگز اور ویب سائٹس پر بہت سارا مواد مضامین اور مباحثات کی شکل میں اس کے علاوہ ہے۔ MD کے تدریسی

پروگراموں اور ورکشاپس میں مختلف ممالک اور شہروں سے وابستگان آن لائن بھی شریک رہے۔

میرے محدود مطالعے کی حد تک مدرسہ ڈسکورسز کے بارے میں اخباری کالموں سے صرف نظر کرتے ہوئے جو وقیع علمی مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں چند قابل ذکر ہیں:

(۱) مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب کا مضمون ''مدرسہ ڈسکورسز کے بارے میں'' (ماہنامہ الشریعہ شمارہ اگست ۲۰۱۸ء)۔ امسال اواخر جولائی میں MD کی مرکزی ٹیم کی پاکستان آمد اور اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد کے ہال میں منعقد ہونے والے پروگرام میں مولانا زاہد الراشدی کی شمولیت' اور بعض حلقوں کی جانب سے اس پر تشویش اور استفسار پر مولانا کی وضاحت۔ اس مضمون میں مولانا نے دینی مدارس کی خدمات' تقاضے اور ضروریات کے عنوان پر بہت دلسوزی سے پچیس سال قبل تحریر شدہ مفصل مضمون کو مکمل دینے کے بعد صورت حال کے تدارک کے لیے چار عملی صورتیں مختصراً بیان کیں' جن میں سب سے آخری تین میں وہ مدرسہ ڈسکورسز پراجیکٹ کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور تعاون کی توجیہہ کرتے ہیں۔ اس پر خاکسار کا تبصرہ بعد میں آئے گا۔

(۲) فاضل دانشور محمد دین جوہر صاحب کا انتہائی فکر انگیز اور تنقیدی مضمون بعنوان ''مدرسہ ڈسکورسز کا فکری اور تہذیبی جائزہ'' الشریعہ کی ماہ ستمبر ۲۰۱۹ء کی اشاعت میں منظر عام پر آیا جس کے کچھ حصے قبل ازیں ان کے بلاگ پر دیے گئے تھے۔ علمی بنیادوں پر اٹھائے گئے انتہائی گہرے تنقیدی نکات کے ساتھ ساتھ لیکن لطیف و پرمزاح جملوں سے معمور مضمون کا ماہنامہ الشریعہ میں شامل اشاعت ہونا یقیناً جریدے کے مؤسس اور مدیر مسئول کی وسعت ذہنی اور فراخدلانہ پالیسی کا مظہر ہے۔ جوہر صاحب نے بجا طور پر اخباری کالموں میں اٹھائے گئے اعتراضات کو ''سطحیت اور شرم ناک ذہنی پسماندگی'' قرار دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود ان کی تحریر کے بعض پیراگراف اتنے گنجلک اور دقیق ہیں کہ ان میں متعدد نکات اور اصطلاحات ''شرح غریب'' کا تقاضا کرتی ہیں۔ اگرچہ وہ اپنا بنیادی/مرکزی نکتہ یا مدعا گاہے انتہائی سادہ اور سریع الفہم دو تین جملوں میں بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اہم جملے اس کی مثال ہیں:

☆ جدیدیت کا بنیادی ترین مطالبہ یہ ہے کہ اسے انسانی شعور' تاریخ اور نیچر میں واحد معرّف (definer) کے طور پر تسلیم کیا جائے۔

☆ اگر مذہب اپنے واحد حامل حق ہونے کے دعوے سے دستبردار ہو جائے تو جدیدیت سے توافق اور تسویہ و تطبیق ممکن ہے۔ اسلام کے برعکس دنیا کے باقی تمام مذاہب جدیدیت کے روبرو اپنے اساسی موقف سے دستبردار ہو کر اس کے سائبان میں پناہ لے چکے ہیں..... اور مذہبی جدیدیتوں (عیسائی اور یہودی) نے استعمار اور استشراق کا خوب خوب ہاتھ بٹایا۔

☆ اگر جناب ابراہیم موسیٰ کی دردمندانہ 'مساعی علمیہ' سے اسلام بھی ایک contending modernity

کا شرف حاصل کرے تو اسلام بھی عیسائیت اور یہودیت کی طرح جدیدیت کا pet (پالتو) بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس کے حامل حق ہونے کے دعوے سے رستگاری کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

☆ مدرسہ ڈسکورسز بنیادی طور پر تاریخ کی شرائط پر ہدایت میں قطع و برید کا منصوبہ ہے۔

☆ تاریخ کو انسانی ہستی کے اصل الاصول کے طور پر قبول یا تسلیم کرنا مذہبی عقیدے کی نفی ہے..... ہدایت راکب ایام ہے مرکب ایام نہیں۔ اگر تاریخ کو ہدایت کی تعبیر میں اصل الاصول کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو معاشرے سے مذہب کا خاتمہ ایک یقینی ہدف کے طور پر زیر عمل لایا جا سکتا ہے۔ اور جدیدیت کے انسانی زندگی کے واحد معرّف بن جانے کے حقیقی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

محمد دین جوہر صاحب نے مدرسہ ڈسکورسز کی تفہیم دین کے حوالے سے علمیاتی اپروچ اور منہج کو بجا طور پر انیسویں صدی سے شروع ہونے والے استعماری اور استشراقی اثرات کے تحت دین کی تشریح و تعبیر کی اس تحریک سے جوڑا ہے جس کا آغاز سر سید احمد خان اور بعد ازاں متعدد حضرات نے کیا اور پھر جس کو بیسویں صدی میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور بہت سے دوسرے متجددسکالرز نے نہ صرف جاری رکھا بلکہ آگے بڑھایا۔ بعض فقہی و قانونی معاملات میں روایتی اور متواتر مواقف کی تنقیص اور تحدید کے ساتھ ان حضرات نے بالعموم جدید فلسفہ و فکر سے مرعوب ہو کر لبرل اور تکثیری (pluralistic) نقطہ نظر کو پروموٹ کیا۔ اس اعتبار سے وہ مدرسہ ڈسکورسز کے امریکی ورژن آف اسلام کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی فاتحانہ آمد ثانی قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔

مغربی دنیا کے تھیولاجیکل اور کلچرل تکثیریت کے فلسفے نے بہت سے دوسرے ممالک کے مسلمان دانشوروں کو بھی متاثر کیا ہے اور وہ اس خیال کے حامل اور وکیل بن گئے ہیں کہ ہمیں معتقدات اور افکار کے حوالے سے اپنے آپ کو دوسروں یعنی مختلف نقطہ نظر رکھنے والے لوگوں سے علیحدگی اور اجنبیت کی بجائے انہیں اپنے قریب لا کر ایک متضمن اور جامع (inclusive) کمیونٹی کا تصور ابھارنا چاہیے۔ اپنے سے مختلف زاویہ نگاہ رکھنے والے یعنی بظاہر متخاصم گروہ یا فرقے کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہونا چاہیے کہ گویا وہ اور ہم ایک ہی بڑے درخت کی شاخیں ہیں اور اپنی روایت یا نقطہ نظر سے دلی وابستگی اور تعلق کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم دوسروں کے بارے میں منفی جذبات اور نفرت رکھیں۔ ہر گروہ مذہب/وحی ہی کے کسی پہلو کے بارے میں مختلف تعبیر یا زاویہ نگاہ رکھتا ہے اور بس۔ ایک امریکی مفکر اس صورت حال کو communities of interpretations کا نام دیتا ہے۔ پروفیسر ابراہیم موسیٰ سے ملتی جلتی سوچ رکھنے والے ساؤتھ افریقہ کے پروفیسر اسحٰق فرید اپنی تصنیف ''Quran, Liberation and Pluralism:An Islamic Perspective'' میں بھی اسی قسم کا تکثیری فکر پیش کرتے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ تمام اصحاب اپنے تئیں اس فہم و فکر کو مبنی بر ''علم'' خیال کرتے ہیں، جبکہ ان سے اختلاف رکھنے والا تصنیفی کام محض ''پروپیگنڈا'' ہوتا ہے۔ اسی طرح پروفیسر عبدالعزیز

ساشا دینا اپنی کتاب بعنوان ''Islamic Roots of Democratic Pluralism'' میں کلامی اور عقائدی تعبیری اختلافات کی بجائے اخلاقی اعمال اور بھلائیوں کو ترجیح دینے کو اہم تر خیال کرتے ہیں۔ اس فکر کے تمام حاملین میں یہ نکتہ مشترک ہے کہ وہ سب اسلام بحیثیت راسخ العقیدہ خدا مرکز مابعد الطبیعیاتی دینی روایت کی وسیع الخیال انسان دوست سوچ اور رویے میں تخفیف و تقلیل کرنے کے قائل ہیں۔ انگلستان میں طویل عرصے سے قیام پذیر اور علمی حلقوں میں معروف عوامی دانشور اور براڈ کاسٹر ضیاء الدین سردار اکیسویں صدی میں اسلام کا ''گلوبل تعارف'' بھی اسی انداز سے کراتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خیال میں ہر وہ کاوش جو آزادی فکر پر مشتمل ہو انسانی روح کو توانائی اور خروش عطا کرتی ہے۔ مرکز سے زندگی بخش ارتباط کے لیے لازم ہے کہ ان (فرد، معاشرہ) کی پہچان وقت کے ساتھ بدلتے سانچوں کے اعتبار سے ہوتی رہے۔ الغرض وہ اسلام کو changing and relativistic world-view کے طور پر لیتے ہیں۔ یاللعجب! سردار گزشتہ دس بارہ سالوں سے اپنے آپ کو اور اپنے ہم خیال حلقے کو کریٹیکل مسلمان (The Critical Muslim) کا لیبل دے رہے ہیں اور اسی عنوان سے سہ ماہی مجلّہ شائع کر رہے ہیں۔ کریٹیکل مسلم کی حیثیت سے ضروری علمی صلاحیت اور دینی علوم کے مطالعے کے بغیر وہ اپنے آپ کو مفسرِ قرآن، شارح شریعت اور مجتہد سبھی کچھ سمجھتے ہیں اور الٹرا جدیدیت کی راہ پر بگٹٹ رواں دواں ہیں۔

(۳) ماہنامہ البرہان کے اگست اور ستمبر ۲۰۱۹ء میں شائع ہونے والے تین مضامین۔ پہلی مختصر لیکن MD کے بنیادی تصورات پر اٹھائے گئے اہم تنقیدی نکات پر مبنی پروفیسر زاہد صدیق مغل صاحب کی تحریر 'تجدد کا پائے چوبیں' ہے۔ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل میں ہونے والے سیمینار میں شرکت کی تھی اور مدرسہ ڈسکورسز کے زیر اثر حضرات کی آراء کو بالمشافہ سن کر اپنے تاثرات اختصار کے ساتھ بیان کیے۔ کئی حضرات (جناب ثاقب اکبر، خورشید ندیم اور مہان مرزا صاحب) نے یہ خیال پیش کیا کہ ماضی کا فہمِ اسلام نئے دور میں متروک سمجھا جانا چاہیے۔ ثاقب اکبر صاحب نے اس مقدمے کو چند جزوی فقہی مسائل کے حوالے سے واضح کرنے کی کوشش کی (مثلاً خاتون کی گواہی) اور اصرار کیا کہ نیا اجتہاد کیا جانا چاہیے۔ ثاقب اکبر صاحب نے ایسا اجتہاد نہ کرنے والوں کو ''عقل دشمنی'' سے بچنے کا مشورہ بھی دیا۔ مذکورہ تین جدت پسند سکالرز نے ماضی کے فہمِ اسلام کو نئے دور میں متروک بتایا، جبکہ چیف انوسیٹی گیٹر مدرسہ ڈسکورسز پروفیسر ابراہیم موسیٰ نے کھٹمنڈو (نیپال) میں منعقدہ سمرانٹسو ۲۰۱۸ء میں امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب ''ارشاد الطالبین'' کے مباحث کی روشنی میں دین کی تفہیم کے لیے لامحدود امکانات پر زور دیا۔

خورشید ندیم صاحب نے ایک اور خطرناک تھیسس پیش کیا۔ ان کے مطابق علم کلام مذہب کا داخلی مسئلہ نہیں ہے بلکہ خارج سے آمدہ مطالبات و چیلنجز کی بنیاد پر مذہبی اذہان کو مطمئن کرنے کے لیے وجود میں لایا جاتا ہے۔

اگر خارج کے حالات بدل جائیں تو لازم ہے کہ ماضی کی پوری علمی روایت (بشمول علم تفسیر) کو بھی ترک کر دیا جائے اور اس کا بوجھ مذہب پر نہ لادا جائے۔ پروفیسر زاہد صدیق مغل بالکل صحیح طور پر اس کا حاصل یہ سمجھتے ہیں کہ دین کی اپنی کوئی حیثیت و اصالت ہے ہی نہیں' یہ صرف خارج کا مرہونِ منت ہے۔ دراں حالیکہ یہ فکر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ہاں قطعاً بار نہیں پا سکتی' کیونکہ یہ ان کے عقائدی ثوابت' مسلمات اور محکمات سے ٹکراتی ہے۔

ڈاکٹر مہان مرزا نے 'تاریخ عظیم' (Big History) اور کاسموجینیسس (Cosmogenesis) کا حوالہ اس طرح دیا کہ گویا یہ مذاہب اور قرآن کی بتائی ہوئی آفرینش کائنات اور اس میں حضرت انسان کی آمد پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ موڈرن کاسمولوجی کے تصورات زمانی طور پر کئی لاکھ سال پیچھے جا کر بگ بینگ کے نتیجے میں تخلیق کائنات کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ مہان مرزا صاحب نہ معلوم زمین پر انسان کی ابتدا اور اخلاقی زندگی کے بارے میں قرآنی بیانیے کو 'تاریخ عظیم' کی روشنی میں مزعومہ تغیر و تبدل کے بعد کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کی حالیہ وزٹ میں انہوں نے لاہور میں ازراہِ کرم قرآن اکیڈمی میں ہم سے بھی ملاقات کی جو عصر سے مغرب کے درمیان ایک گھنٹے پر مشتمل گفت و شنید تھی۔ اس میٹنگ میں بھی انہوں نے تاریخ عظیم کا ذکر ایسے وثوق سے کیا کہ جیسے یہ کوئی نئی دریافت ہے جو پورے روایتی دینی narrative کی چولیں ہلا دے گی۔ ایک اور انکشاف جس پر راقم ششدر رہ گیا' وہ فطرت انسانی کے بارے میں تھا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں (یعنی نصوصِ قرآنی اور احادیث نبویہ میں وارد صراحت کا صاف انکار۔) مدرسہ ڈسکورسز کے ایک فیض یافتہ انقلابی تحقیق کار وقاص احمد نے قطر کی ونٹر انٹنسو ۲۰۱۹ء میں اظہار خیال کرتے ہوئے Big History کا تعارف کروایا اور ارشاد فرمایا کہ کس طرح اس سے پورا ورلڈ ویو تبدیل ہو جاتا ہے' اور مذہب کے سامنے کیسا شدید چیلنج پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے مطابق تاریخ عظیم ارتقاء سے بھی آگے کی چیز ہے اور اس سے مذہب کی جڑ بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ (بحوالہ MD ہینڈ بک صفحہ ۴۵)

سیمینار میں پروفیسر زاہد صدیق مغل نے ڈاکٹر مہان مرزا کے سوالات انہی پر لوٹاتے ہوئے کہا کہ آپ سارا بوجھ اہل مذہب پر ہی ڈال رہے ہیں' لیکن بگ ہسٹری سے جنم لینے والے سوالات کے تناظر میں جدید انسان کے غیر مذہبی اخلاقی تصورات کی کیا حیثیت رہتی ہے' اس پر بھی غور و فکر ہونا چاہیے۔ اور یہ ذمہ داری آپ کی بنتی ہے کہ آپ اس کا جواب دیں۔

ایک دوسری تھیم جس کا اظہار متعدد شرکاء (بشمول جناب اکرم ورک اور ڈاکٹر خالد مسعود صاحب) نے کیا وہ ان دانشوروں کے مطابق فقہ اور دین میں تفریق کی ضرورت ہے۔ دراں حالیکہ دین کے روایتی' معتبر اور متواتر تصور کے مطابق احکام و معتقداتِ دینی کے اعتبار سے دین اور فقہ میں کوئی دوئی نہیں ہے۔ فقہاء کرام کا

فقہی استنباط بنیادی طور پر قرآن وسنت نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے تلقی وفہم پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ فقہ انسانی ذہن کی زائیدہ نہیں بلکہ دین کے ساتھ گہری وابستگی رکھتی ہے اور فقہ کے بغیر دین کا تصور انفرادی واجتماعی زندگی کے ضابطہ حیات کے طور پر ناممکن ہے۔ ہدایت ربانی صرف تجریدی قضایا یا بالفاظِ دیگر خالی خولی بے ثمر ایمانیات پر مبنی نہیں بلکہ یہ نظری وعملی راہنمائی کا ایک مکمل پیکج ہے۔ نبی ﷺ کے قول مبارک کے مطابق دین ''ما انا علیه واصحابی''، یعنی معتقدات اور اعمال (paraxis) کے مجموعے کی شکل میں جدید فلسفیانہ اصطلاح میں 'Form of Life' ہے جس کی طرف ان دانشور حضرات کی بے اعتنائی افسوسناک اور حیران کن ہے۔

بقیہ دو مضامین مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب کے قلم سے ہیں جن کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں:

☆ علماء کرام کے تساہل اور علمی کمزوری کی وجہ۔ پاکستان میں تجدد کی پھیلتی ہوئی تحریک

☆ مدرسہ ڈسکورسز کے حامی بالواسطہ تجدد کو فروغ دے رہے ہیں

دونوں تحریریں اخلاص سے مزین اختصار اور مدلل انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ان کا گہرا کرب وسوز صاف جھلکتا ہے۔ دونوں مضامین کے عنوانات سے ظاہر ہے کہ ان کا مدرسہ ڈسکورسز پر نقد تجدد کے حوالے سے ہے اور انہی پر ان کا فوکس ہے۔ اور راقم کے خیال میں یہ بالکل درست بھی ہے کیونکہ MD کا مرکزی اور محوری نکتہ جسے وہ 'تجدید' سمجھتے ہیں' فی الحقیقت تجدد ہے۔ ڈاکٹر محمد امین صاحب اپنے طویل مضمون (البرہان' ستمبر ۲۰۱۹ء) کے سب سیکشن ۶ میں چند سطور میں تجدید اور تجدد کے درمیان فرق اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ''یہاں 'تجدد' اور 'تجدید' کا فرق بھی ملحوظ رہے۔ متجددین اپنے منہج کو 'تجدید' کہتے ہیں۔ وہ گویا یہ سمجھتے ہیں کہ امت نے اور اس کے مفسرین' محدثین' مجتہدین' علماء' فقہاء نے قرآن وسنت کی غلط تشریح کی ہے اور اس میں ایسے اضافے کر دیے ہیں جو قرآن وسنت کی روح سے مطابقت نہیں رکھتے' لہٰذا ان کو دین سے نکال دینا چاہیے۔ دین کو اس جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر دینا چاہیے اور عصر حاضر (یعنی مغرب کی الحادی فکر و تہذیب) کے اصولوں اور تقاضوں کے مطابق دین کی نئی تشریح وتعبیر کرنی چاہیے۔ یہ اس کام کو دین کی ''تجدید'' قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جمہور اہل سنت کی رائے یہ ہے کہ جو لوگ قرآن وسنت کے اس فہم کو قبول نہیں کرتے جو اسلاف سے متوارث چلا آ رہا ہے اور معتزلہ کی طرح مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی روشنی میں دین کی نئی تعبیر وتفسیر کرنا چاہتے ہیں' وہ ''متجدد'' ہیں اور وہ ان کے منہج کو تجدد کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر محمد امین صاحب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ مغربی فکر وتہذیب سے متاثر MD کے دانشور حضرات تجدید سے کہیں آگے جا کر دین کے مسلّمہ عقائد و مفاہیم کی تعبیر اس طرح کر رہے ہیں کہ وہ مغربی سیکولر فکر و تہذیب کے مطابق ہو' کیونکہ جمہور اہلِ سُنّت کے افکار ان کے نزدیک غلط اور جمود زدہ ہیں۔ ابھی چند ہفتے قبل

قرآن اکیڈمی میں ملاقات کے دوران ڈاکٹر مہان مرزا گفتگو کے دوران بار بار مؤسس انجمن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے کتابچے ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کا حوالہ جس طرح دے رہے تھے (اور یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کی آنکھوں کی چمک بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے)' گویا وہ MD کے تحت اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہی کا کام کر رہے ہیں اور ساتھ ہی وہ اس پورے پراجیکٹ میں کسی مفروضہ conspiracy (در پردہ عزائم) کی بھی تردید کرتے رہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مؤسس انجمن کے ذہن میں ان کے طرز پر اسلام کے بنیادی عقائد کو سائنس اور ہسٹری کی روشنی میں reinterpret بلکہ صحیح تر الفاظ میں redefine کرنے کا کوئی خیال یا وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ نشاۃِ ثانیہ سے ان کا مقصود قرآن وحدیث کی تصریحات اور اسلام کے ٹھیٹھ عقائد کو جدید ذہن کے لیے عصری اسلوب میں قابل فہم بنانا تھا نا کہ ان کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا یا جوہری تبدیلی کر کے ان کی روح اور روایتی معنویت کو ختم کر دینا۔

غیر معمولی ذہانت' محنت اور مستعدی سے متصف ڈاکٹر عمار خان ناصر کے والد گرامی اپنی وضع قطع اور انتہائی سادہ رہن سہن کے باوجود خود اپنی افتادِ طبع میں اور پھر پاکستان سے باہر مختلف ممالک بشمول یورپ اور امریکہ کے اسفار اور کثیر المذاہب کمیونٹیز کے مشاہدے' انٹرایکشن اور علمی وفکری تبادلہ خیال کے زیر اثر بہت سے ایشوز میں وسعت نظری' رواداری اور ایک درجے میں روشن خیالی کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے صاحبزادے کو بھی ہر قسم کے مطالعات اور آراء کے اظہار کی کھلی چھوٹ دی' اگرچہ ساتھ ہی وہ انہیں اپنے دینی مراجع ومصادر کے گہرے مطالعے اور اساسی اصولوں اور محکمات سے جڑے رہنے کی تاکید بھی کرتے رہے۔ بایں ہمہ وہ خود اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ اہل اسلام دنیا کی دوسری اقوام سے بالکل الگ تھلگ isolated and self-enclosed entity کی صورت میں رہیں۔ عصر حاضر کے گلوبل سیٹ اپ میں دوسری تہذیبوں اور مذاہب کے لوگوں سے رابطہ از بس ضروری ہے' کیونکہ وہ سب اسلام کے نقطہ نظر سے امت دعوت کا حصہ ہیں۔ اپنی حالیہ تحریروں میں مولانا نے زیادہ کنزرویٹو اور دین وشریعت کی ماثور ومتواتر روایت سے چمٹے اور اپنے خول میں بند رہنے والوں کے رویے کو ''چھوئی موئی'' اور ''لامِساس'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس ضمن میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا ہے جو کثیر ممالک میں گھومے اور کچھ عرصہ قیام کر کے ہر ہر جگہ کے لوگوں سے ان کے مذہبی' ثقافتی اور سیاسی افکار سے بلاواسطہ واقفیت حاصل کی اور اسی طرح ذہنی وعلمی کشادگی اور گہری بصیرت کے ساتھ وطن واپس لوٹے۔ ہم مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب کی علمی عظمت اور دینی منزلت کے مداح ہیں لیکن راقم کو مغرب میں طویل عرصہ قیام کے تجربات کی روشنی میں مولانا کی اس فکر اور اپروچ میں خاصے خطرات اور تحفظات نظر آتے ہیں۔

مدرسہ ڈسکورسز کی ٹاپ قیادت یقیناً کلاسیکل عربی زبان پر خوب دسترس رکھتی ہے۔ اور انہوں نے قرآن'

حدیث' فقہ اوران کے علوم کی امہات کتب اور دیگر دینی' تاریخی' ادبی لٹریچر کو کھنگالا ہوگا۔ ڈاکٹر عمار خان ناصر کی تو آغاز ہی سے ایک خالص حنفی دیوبندی خانوادے میں (دادا اور والد کے زیر سایہ) تربیت ہوئی اور بلاشبہ ان کی علمی نظر' تحقیقی ذوق اور دینی موضوعات کا مطالعہ اور فہم قابل ستائش ہے۔ مغربی فلسفہ وفکر اور پوسٹ ماڈرن تھاٹ بھی ان کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ کاش قرآن و حدیث' فقہ اور اسلامک سٹڈیز میں گہری ممارست اور آئیڈیل ترین گھر اور مدرسے کا روایتی اسلامی ماحول عمار ناصر صاحب کو ایک طرف وحی ربانی کی روشنی میں ملنے والی ہدایت (الہدیٰ) اور اس پر وثوق اور دوسری جانب عقلی تفکیر اور ظن اور ہویٰ میں فرق وامتیاز پر قائم رکھتے۔ اول الذکر وہ پوزیشن ہے جس کا انبیاء کرام علیہم السلام اور تکمیلی شان کے ساتھ خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو دعویٰ ہے' اور دوسری دعویٰ کی حد تک بھی اسی پوزیشن اور سعادت سے محروم' فحوائے آیت قرآنیہ: ﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾﴾ (النجم)

یہاں میں ایک ہی خاندان میں بزرگوں اور نئی جنریشن کے درمیان فکری بعد اور تناقض کی ایک اور parallel مثال قارئین کی دلچسپی کے لیے دوں گا۔ منٹگمری (حال ساہیوال) میں برادر بزرگ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قائم کردہ ہاسٹل (دار المقامہ ۶۵-۱۹۶۲ء) میں ہم چند کالج کے طلبہ کے لیے عربی اور قرآن وحدیث کی تدریس کے لیے ہمارے اتالیق صہیب حسن صاحب (خلف الرشید مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ) تھے۔ انہوں نے بعد ازاں مدینہ یونیورسٹی سے دینی علوم کی تکمیل کی اور پھر سعودی حکومت کے دعوت وارشاد کے مؤسسہ سے منسلک ہو کر مبعوث کے طور پر چند سال افریقہ کے کچھ ممالک اور پھر غالباً ۱۹۷۴ء سے انگلستان میں مستقل رہائش اختیار کی اور ایک متحرک داعی کی حیثیت سے مساجد کے قیام وانصرام اور تبلیغ دین میں مسلسل مشغول ہیں۔ اعلیٰ دعوتی مقاصد کے پیش نظر انہوں نے برمنگھم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ بھی کر لی تھی۔ ڈاکٹر صہیب حسن صاحب کے کئی بچوں کی ولادت انگلستان میں ہوئی اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ان کے صاحبزادگان میں سے ایک اسامہ حسن نے دینی اور عصری سائنسی تعلیم دونوں میں نمایاں پوزیشن لی۔ چنانچہ وہ حافظ قرآن' امام (جمعہ کا خطاب اور امامت) کے ساتھ فزکس کے ایک جدید ترین شعبے میں ڈاکٹریٹ کیے ہوئے ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں انڈر گریجویٹ سٹڈیز کے دوران ان کے اساتذہ میں پروفیسر سٹیفن ہاکنگ بھی شامل تھے۔ چنانچہ اب وہ سوشل میڈیا اور TV پروگراموں میں امام ڈاکٹر اسامہ حسن کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اگرچہ شومئی قسمت' کہ اب اسلام کے حوالے سے ان کے خیالات ٹھیٹھ دینی معتقدات رکھنے والے والد محترم سے بہت مختلف ہیں۔ راقم کو باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت سے مسائل میں مجمع علیہ مواقف سے متعارض رائے رکھنے پر انگلستان کے جمہور مسلمانوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اغلباً ردعمل کے طور پر ماجد نواز اور دوسرے جدیدیت گزیدہ نوجوانوں کے تھنک ٹینک Quilliam Foundation میں شمولیت اختیار

کرلی۔ اس فاؤنڈیشن کے مقاصد میں پلورل ازم اور سوشل تبدیلی کو پروموٹ کرنا اور پولیٹکل اسلام (جو ان کے خیال میں اکثر انتہا پسند اور متشدد ہوتا ہے) کی مخالفت ہے۔ ڈاکٹر اسامہ حسن نے ڈیڑھ دو سال قبل سٹیفن ہاکنگ کے ارتحال پر دو تین گھنٹوں کے اندر In memorium کے عنوان سے ایک طویل پوسٹ اپنی فیس بک وال پر لگائی، جس کے آخر میں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحمت و عافیت کی دعا بھی کی، جو بہر آئینہ جمہور اہلِ سنّت کے عقائد کے اعتبار سے تو درست نہیں ہے۔

راقم کی ناچیز رائے میں مدرسہ ڈسکورس کے دانشور اصحاب کا سارا فوکس عقل و خرد کی خود ساختہ گتھیاں سلجھانے پر ہے، جب کہ میں ان کی تحریروں اور گفتگوؤں میں ایک طرح کا ''angst'' (بے چینی اور خوف و پریشانی) کا عنصر واضح طور پر دیکھتا ہوں۔ میرے اس شدید احساس کو الفاظ میں ادائیگی اور وضاحت کے لیے مدد مدیر ایقاظ حامد کمال الدین صاحب اور جناب محمد دین جوہر کے جواہر پاروں سے ملتی ہے، جس کے لیے میں ان دونوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ مدرسہ ڈسکورسز کے نزدیک عقل، منطقی استدلال، تجزیہ و تحلیل ہی سے تمام عقدوں اور مسائل کا حل ممکن ہے اور وہ اس طرح قلب و صدر کی ضروریات، علمیاتی اہمیت اور کیفیات سے بالکل اعتنا نہیں کرتے۔ وحی کی ہدایت پر انحصار کم کر کے اپنی ہی پراگندہ خیالی کو نہایت قابل اعتماد اور قابل ترجیح جاننا..... اُف! کسی قدر نادان ہے انسان اور کس قدر حد سے گزر جانے والا! اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ جدید اصطلاحات کو نیا پیرہن دے کر بزعم خویش یہ ان کے حریم ہدایت میں فاتحانہ داخلے کی راہ ہموار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے سلف صالحین سے منقول دینی مفاہیم کو نئے معانی اور نئی تعبیر دے کر روایتی مسلمانوں کو مذہب کی جکڑ بندیوں سے آزاد کروا دیا ہے۔ ایک زیادتی اور دوسری نادانی۔ 'وحی' ہاتھ سے چھوٹے تو یہی چیز ہاتھ آتی ہے اور یہ ان کو کمال کی چیز لگتی ہے اور یہ اس پر بغلیں بجاتے ہیں۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے بڑے بڑے فلاسفر (بالخصوص فرینکفرٹ سکول آف تھاٹ) لکھ چکے ہیں کہ ماڈرن ازم اور لبرل ازم نے عیسائیت کے جبر سے آزادی کے نام پر وہ جبر قائم کیے جس کا تصور عیسائیت میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام کا راست پیغام اور قرآن و سنت کا صحیح اور معتدل فکر امت میں مسلسل زندہ متوارث روایت کی شکل برقرار رہا ہے لیکن اس کے علی الرغم پروفیسر ابراہیم موسیٰ بہت سے دینی تصورات کی تفہیم کے منہج کے ضمن میں امام عبدالوہاب الشعرانی کی کتاب ''ارشاد الطالبین'' کی روشنی میں ایک Poetic sensibility کو استعمال کرنے کا خیال پیش کرتے ہیں جس سے تدبّر و تفکّر کے امکانات (contingencies) لامحدود ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اصرار کرتے ہیں کہ: We need to develop aesthetic sensibility

اب ظاہر ہے کہ جمالیاتی شعور و احساس کا تعلق عقل و منطق سے زیادہ قلبی اور ذوقی رجحان اور عواطف سے ہے۔ تخیلاتی اور جمالیاتی حس اسی طرح کا 'اٹکل' ہے جسے آزمانے سے انسان کو مستغنی کر دینے کے لیے

انبیاء کے جلو میں ایک صاف شفاف وحی اُترتی رہی ہے۔ قرآن کریم سے مسلمانوں کا تعلق صرف فہم تک محدود محض ذہنی نہیں بلکہ وجودی ہے۔ الحق (ہدایت ربانی) ذہن کے ساتھ دل کو بھی بدل دیتا ہے۔ سچے مؤمن وہ خوش نصیب ہوتے ہیں جو حق کو دائرہ شعور کا زندہ مرکز بنا لیتے ہیں اور خیر کو دائرہ وجود کا۔ قلوب کے تمام امراض کی شفا خدا کی 'وحی' میں رکھی گئی ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾

(بنی اسرائیل)

''اور ہم قرآن (کے ذریعے) وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مؤمنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔'' (ترجمہ فتح محمد جالندھری)

''وحی'' کے سوا ذہنی گرہوں اور خلجان کا حال اور سینوں کے امراض کی شفا اگر کہیں مل جاتی تو پھر ''وحی'' کی کیا خصوصیت رہ جاتی؟ چنانچہ رب کائنات نے شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ اپنی تنزیل کو کہا ہے۔ فتنوں کی آماجگاہ اور ابلیس کا اصل نشانہ مؤمن کا دل ہے۔ مدرسہ ڈسکورس میں قلب اور صدر کا کوئی تذکرہ نہ ہونا بلاسبب نہیں۔ یہ ان کے پرسپیکٹو سے باہر کی حقیقتیں ہیں' جبکہ قرآن نے آخرت کی کامیابی و کامرانی کو قلبِ سلیم کے ساتھ مشروط ٹھہرایا ہے:

﴿اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الشعراء)

''ہاں جو شخص اللہ کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا)۔''

مصدقہ روایت (authentic tradition) سے تعلق منقطع اور آزادروی کی روش اپنانے کے بعد قرآن بس اپنی ظاہری ہیئت میں باقی رہ جاتا ہے اور اس کے معانی' مدلول اور مطالب پر طبع آزمائی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر مسلم ممالک کے جدید تعلیم یافتہ حضرات اور مغربی اکیڈمیا میں 'تشکیل جدید' اور 'ریفارمسٹ اسلام' کی چھتری تلے یہی کچھ ہوا ہے۔ اور 'غریب' اسلام کے ساتھ معاملہ وہی ہوا کہ 'پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ جمالیاتی شعور و احساس کی منہاجی ندرت' تفرد اور تخلیقی فکر کے پردے میں طلبہ میں انتشارِ فکری اور تشکیک پیدا کرنے کے بعد مغربی دنیا کے پروفیسروں کے مخصوص انداز میں ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ نہایت عاجزی اور تواضع کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''آپ چاہیں تو اسے پھینک دیں' لیکن اس تناظر میں مضمر نئی ممکنات (contingencies) بہرحال ہمارے لیے نئی فکری دنیائیں پیدا کر سکتی ہے''۔ تشریح و تعبیر میں وسیع المشربی کی ترجیح کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ ''میرے پاس اس سوال کا حتمی جواب نہیں بلکہ ممکنہ بیانیہ ہے''۔ MD کی ہینڈ بک میں دیے گئے کئی شرکاء کے تاثرات اپنے اندر جہان معنی رکھتے ہیں' جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں' لیکن میرا احساس یہ ہے کہ ان کورسز کے شرکاء نے دو عظیم پروفیسروں ابراہیم موسیٰ اور مہان مرزا کے خیالات کو بڑی

حد تک قبول (internalize) کر لیا ہے۔MD پراجیکٹ کے منصوبہ سازوں کا باقاعدہ پروگرام اور نظریہ ہے کہ ان کا کام طلبہ اور شرکاء کورس کے اذہان میں سوالات اٹھانا ہے' جواب ہر ایک کو خود تلاش کرنا ہے۔ ڈاکٹر مہان مرزا کے الفاظ میں 'ہمارا کام یہ نہیں کہ آپ کو یہ بتائیں کہ کیسے سوچیں' بلکہ یہ بتانا ہے کہ بس سوچیں''۔یعنی موضوع سے متعلق ابحاث کا استقصاء کر کے فیصلہ شرکاء کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قارئین کرام بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ناپختہ مسلم اذہان کو سوچ وفکر کے گھوڑے دوڑانے کا کھلا لائسنس ملنے پر یہ حضرات وخواتین' کیا گل کھلائیں گے اور اُمّتِ مُسلمہ کے نکبت واد بار میں اضافے کے علاوہ اور کیا ہوگا؟

نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن راقم کا خیال ہے کہ مغربی ممالک اور بالخصوص امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں میں حکومت اور اکیڈمیا کی پالیسی اچھے اور برے مسلمانوں (Good Muslims vs Bad Muslims) کے درمیان امتیازی اور شنوی تقسیم کو نمایاں کر کے غیر سیاسی (apolitical)' امن پسند اور کثیر ثقافتی و مذہبی کمیونیٹیز کی تعریف' توصیف اور ترجیح دینا ہے' جبکہ اسلام کو بطور دین اپنانے اور باطل اور شر کے خلاف اٹھنے والے مسلمانوں (Disssenting Muslim Activists) کو نہ صرف حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے بلکہ تشدد اور قید و بند کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ مدرسہ ڈسکورسز کے پروفیسر حضرات نے امریکی اکیڈمک اسٹیبلشمنٹ کے زیر اثر مغربی اقدارِ حیات' ثقافتی رجحانات اور علمی آراء سے نہ صرف خود سازگاری اختیار کر لی ہے بلکہ وہ آگے بڑھ کر اس کا نفوذ بلادِ اسلامیہ کے دینی مدارس کے فضلاء اور زیرِ تعلیم طلبہ میں بھی کروانا چاہتے ہیں' جبکہ راسخ العقیدہ اور بالغ نظر علمائے حقانی نے اسلام کو بحیثیت دین اور رسول اللہ ﷺ کی مرکزیت اور سنت جو فرد اور اجتماع (polity) دونوں کو راہنمائی و ہدایت دیتا ہے' اپنی کلیت میں پیش کیا ہے اور روایت کو بلا استثناء ٹھیٹھ فقہی معنی میں لیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دین متین اور اس کے تقاضوں کو اسی طرح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں جیسا کہ وہ ہیں۔اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔ آمین!

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص:60 روپے اشاعت عام:30 روپے

امتناعِ سود کا مقدمہ اور اس سے متعلق اُمور کا تعاقب

فیڈرل شریعت کورٹ میں جاری امتناعِ سود کے مقدمے کے ضمن میں کئی محاذوں پر پیش رفت ہوئی جن کے چیدہ چیدہ نکات ذیل میں درج ہیں:

(۱) سیمینارز

(i) انچارج شعبہ تحقیق اسلامی حافظ عاطف وحید صاحب کی کوششوں سے اور فیڈرل شریعت کورٹ اور تنظیم اسلامی کی قیادت کی خواہش پر اسلامک یونیورسٹی کے شعبہ اقتصادیات کے تحت ۱۵ اور ۱۶ جولائی ۲۰۱۹ء کو ایک پروگرام منعقد ہوا جسے ''انٹرنیشنل سمپوزیم آن اسلامائزیشن آف اکانومی'' کا عنوان دیا گیا۔ اس پروگرام میں ملائیشیا سے ڈاکٹر اکرم لال دین، پاکستان سے ڈاکٹر وقار مسعود، ڈاکٹر ارشد زمان، ڈاکٹر اسد زمان، ڈاکٹر سید طاہر، ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی اور دیگر ماہرین نے شرکت کی۔ انچارج شعبہ تحقیق نے اس دو روزہ سمپوزیم کے انعقاد، انتظامات اور اس میں پیش کردہ خیالات وسفارشات کو مرتب کرنے میں یونیورسٹی انتظامیہ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

(ii) دوسرا پروگرام ۶/ اگست کو شریعہ اکیڈمی کے تحت ''پاکستان میں انسدادِ سود کے لیے قانونی جِدّ و جُہد: ایک جائزہ'' کے عنوان سے منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر محمد مشتاق صاحب، مولانا زاہد الراشدی صاحب، جسٹس ریٹائرڈ محمد رضا خان صاحب، قیصر امام صاحب، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل صاحب، مولانا عبدالاکبر چترالی صاحب، ڈاکٹر معصوم یٰسین زئی صاحب اور انچارج شعبہ تحقیق حافظ عاطف وحید صاحب نے خطاب کیا۔ یہ پروگرام چونکہ قانونی جِدّ و جُہد کے پہلو سے منعقد کیا گیا تھا اس لیے یہ سفارشات اور پیش کردہ مقالات انسدادِ سود کی قانونی جدوجہد کے حوالے سے بہت اہم اور مفید تھے۔

(۲) انسدادِ سود کی راہ ہموار کرنے کے لیے لابنگ (lobbying) اور متعلقہ کوششیں

انچارج شعبہ تحقیق اسلامی نے ۲۷/ اگست کو پی ٹی آئی کے قائد اسد عمر صاحب اور بریگیڈیئر بلال صاحب سے ملاقات کی۔ اسد عمر صاحب قائمہ کمیٹی برائے مالیاتی امور کے چیئرمین ہیں۔ اس کمیٹی میں مولانا چترالی کا پیش کردہ ترمیمی بل بھی زیرِ غور ہے۔ اسد عمر صاحب معاشی معاملات کو سمجھتے ہیں۔ انچارج شعبہ نے ملاقات میں انسدادِ سود کے حوالے سے ان کے اشکالات اور سوالات کا بطریق احسن جواب دیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انسدادِ سود کے لیے اپنی آئینی وقانونی ذمہ داری ادا کریں۔ انہوں نے انچارج شعبہ تحقیق کو دعوت دی کہ وہ پارلیمنٹ کی قائمہ کمیٹی میں پیش ہوں اور ربا کے مرحلہ وار خاتمے کا تفصیلی حل پیش کریں تاکہ کارِ معیشت کو بغیر کسی رکاوٹ کے

جاری رکھتے ہوئے امتناعِ سود کا طریقہ وضع کیا جا سکے۔

قائمہ کمیٹی برائے مالیات میں چونکہ مختلف ذہن کے لوگ شامل ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کمیٹی کے اجلاس سے پہلے چیدہ چیدہ ممبران سے ملاقات کی جائے اور ان کی ذہن سازی کی جائے۔

چنانچہ انچارج شعبہ تحقیق نے مندرجہ ذیل پارلیمنٹیرینز/ممبران قائمہ کمیٹی سے ملاقاتیں کیں اور انسدادِ سود کے حوالے سے ان کے اشکالات دور کر کے انہیں تعاون پر آمادہ کیا: (ا) امجد خان نیازی صاحب' ایم این اے' (ب) علی محمد خان صاحب' ایم این اے ومنسٹر آف سٹیٹ' پارلیمنٹری افیئرز' (ج) رضا نصر اللہ صاحب' ایم این اے وممبر قائمہ کمیٹی (د) کیپٹن جمیل صاحب' ایم این اے وممبر قائمہ کمیٹی (ہ) سردار نصر اللہ دریشک صاحب' ایم این اے و ممبر قائمہ کمیٹی (و) فیض اللہ کموکا صاحب' ایم این اے وممبر قائمہ کمیٹی (ز) فہیم خان صاحب' ایم این اے وممبر قائمہ کمیٹی (ح) مولانا عبدالاکبر چترالی صاحب' ایم این اے۔

(۳) قائمہ کمیٹی برائے مالیاتی امور کے اجلاس میں شرکت

مورخہ ۳/اکتوبر کو اسد عمر صاحب کی دعوت پر انچارج شعبہ تحقیق حافظ عاطف وحید صاحب نے قائمہ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ اسد عمر صاحب کے علاوہ احسن اقبال صاحب' حنا ربانی کھر' رمیش کمار اور دوسرے پارلیمنٹیرینز بھی شریکِ اجلاس تھے' جبکہ سٹیٹ بینک اور منسٹری آف فنانس کے نمائندوں نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ انسدادِ سود کے حوالے سے اسد عمر صاحب نے اپنے نیک ارادے ظاہر کیے اور ایک Sub-Committee تشکیل دی جس کا چیئرمین رضا نصر اللہ صاحب کو مقرر کیا۔ اس کمیٹی کے اہداف اور طریقہ کار وضع کرنے کے لیے انچارج شعبہ تحقیق سے کمیٹی کے ساتھ تعاون کا تقاضا کیا گیا ہے۔

(۴) انسدادِ سود کی ویب سائٹ

پاکستان میں انسدادِ سود کے ضمن میں شعبہ تحقیق اسلامی نے ایک ویب سائٹ www.giveupriba.com تشکیل دی ہے۔ اس ویب سائٹ سے منسلک فیس بک کا ایڈریس http//: giveupriba/groups/ www.facebook.com ہے' جس کے ممبران کی تعداد ۱۶۷۰۰ ہے۔ اس ویب سائٹ کو نئے events سے باقاعدہ update کیا جاتا ہے۔ انسدادِ سود کی کوششوں کے ضمن میں جملہ معلومات' تاریخی پس منظر' عدالتی فیصلے' قرآن وسنت کے حوالہ جات' معروف تفاسیر کے اقتباسات اور شرق وغرب کے نامور مفکّرین کے اقوال وتحریرات اس ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔ ویب سائٹ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بائیس ہزار ماہانہ سے متجاوز ہے۔ سود کی نحوست' اس کی شناعت' اس کی مختلف شکلیں اور فروعات' اس کی حرمت' موجودہ استبدادی ساہوکاری بینکنگ سسٹم' مہاجنی بنیاد پر دنیا کی تقسیم' تیسری دنیا کی غربت' سود کے طاغوتی ہتھکنڈے اور مصادر کے بارے میں مواد اس ویب سائٹ پر موجود ہے۔

مِلاكُ التأوِيل (۱۹)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورةُ الانعام

(۱۱۴) **آیت ۱۱۷:**

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَاَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾

''بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں۔''

اور سورۃ النجم میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَاَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ.....﴾ (آیت ۳۰) (مَنْ سے پہلے حرف باء کا اضافہ ہے)

''بے شک آپ کا رب اُس سے خوب واقف ہے جو اُس کی راہ سے بھٹک گیا ہے.....''

اور ایسے ہی سورۃ القلم کی آیت ۷ میں (اور ایسے ہی سورۃ النحل کی آیت ۱۲۵ میں)

دوسری بات یہ ہے کہ سورۃ الانعام میں مضارع کا صیغہ ہے (يَضِلُّ) اور باقی آیات میں ماضی کا صیغہ ہے (ضَلَّ) —— تو ان دونوں باتوں کا کیا مطلب ہے؟

پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ سورۃ الانعام کی آیت میں مَنْ سے پہلے باء ساقط ہے اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے' واللہ اعلم' کہ کلام میں اختصار اور تخفیف کی رعایت رکھی گئی ہے' اس لیے کہ مضارع میں ''ی'' کا اضافہ ہو رہا تھا (يَضِلُّ) تو اس سے پہلے ''مَنْ'' کے ساتھ ''باء'' کو ساقط کر دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں سورۃ النجم اور سورۃ القلم (اور ایسے ہی سورۃ النحل) کی آیات میں چونکہ ماضی کا صیغہ لایا گیا تھا' کہ جہاں کوئی زائد حرف نہ تھا' اس لیے ''مَنْ'' کے ساتھ تاکید کی غرض سے ''باء'' کو لایا گیا۔

اور جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو ذرا ایک نظر اس آیت سے قبل سورۃ الانعام کی آیات پر ڈال لیجیے' بیشتر افعال' فعل مضارع نظر آئیں گے اور مابعد کی آیات میں بھی جن مضامین کا بیان ہو رہا ہے وہ کفار کے حال سے اور مستقبل سے متعلق ہیں' اس لیے یہاں مضارع کا صیغہ لانا ہی مناسب تھا۔

اب رہی سورۃ النجم کی آیت تو سورۃ کا آغاز ہی ماضی کے صیغے سے ہو رہا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ① مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ②﴾

''اور ستارے کی قسم جب اس کا سقوط ہوا' تمہارا ساتھی نہ ہی (راہِ راست سے) ہٹا اور نہ ہی گمراہ ہوا۔''

اور پھر آخر میں مذکورہ آیت آتی ہے: ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ اور یوں نبی ﷺ کی ان تمام باتوں سے براءت کر دی گئی جو وہ ان کی طرف منسوب کر رہے تھے' اور اس میں کنایتاً ان کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کون راہ یاب ہے' اور کون گمراہ ہے' اور اس طرح کنایتاً اور اشارتاً بات کرنا صراحت کے ساتھ کسی کو ملامت کرنے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی سورۃ القلم کی آیت سے قبل کفار کے اتہامات کا رد ہے۔ فرمایا:

﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ②﴾

''آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانہ نہیں ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ⑤ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ⑥﴾

''اور پھر تم بھی دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے' کہ کون ہے جو فتنہ میں پڑا ہوا ہے۔''

اور ان کی اس تہمت جنون کے جواب میں یہ آیت آئی ہے جو ان کے کذب پر دلالت کرتی ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾

یہاں بھی کنایتاً اور اشارتاً ان کے اپنے گمراہ ہونے اور جھوٹ بولنے کا رد کیا جا رہا ہے۔ اور یوں واضح ہو گیا کہ ہر آیت اپنے حروف کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتی ہے۔

(۱۱۵) آیت ۱۲۲:

﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫٢﴾

''اسی طرح کافروں کو ان کے اعمال خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔''

اور سورۃ یونس میں ارشاد فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫﴾

''اسی طرح ان حد سے گزرنے والوں کو ان کے اعمال خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔''

پہلی آیت میں ''كَافِرِيْنَ'' اور دوسری آیت میں ''مُسْرِفِيْنَ'' کہا گیا تو اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الانعام کی آیت سے قبل ارشاد فرمایا:

﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ.....﴾ (آیت ۱۲۲)

''کیا وہ شخص جو کہ مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایک نور بنا دیا کہ جس (کی روشنی) میں وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے.....''

مطلب یہ ہے کہ ایک تو وہ شخص ہے جو جہالت اور کفر کے اندھیروں میں بھٹک رہا تھا تو پھر ہم نے اسے علم

اور ایمان کا نور عطا کیا' تو کیا وہ شخص اس کے برابر ہوسکتا ہے جو ابھی تک جہالت اور کفر کے گڑھے میں پڑا ہے اور وہاں سے خلاصی کا نام نہیں لیتا۔ اسے ڈراؤ تو ڈرتا نہیں' اسے وعظ اور نصیحت کرو تو سنتا نہیں' تو پھر اسے ڈرانا دھمکانا یا نصیحت کرنا یا نہ کرنا سب برابر ہے' تو ایسا شخص کہ جس کے کفر سے باز آنے کا کوئی امکان نہیں تو اس کے لیے یہ کہنا مناسب تھا کہ: ﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢﴾﴾

اب رہی سورۃ یونس کی آیت تو اس سے قبل انسان کی اس متلون حالت کا بیان ہے جس کا نقشہ ان آیات میں ایسے کھینچا گیا ہے:

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ﴾

''اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے' لیٹے بھی' بیٹھے بھی' کھڑے بھی۔''

یعنی ہر حالت میں وہ پھر ہمیں ہی پکارتا ہے' جیسے کہ سورۃ النحل میں بھی ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ﴿٥٣﴾﴾

''پھر جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تم اسی کے سامنے گڑگڑاتے ہو۔''

اور پھر اس کے بعد فرمایا:

﴿فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ﴾ (یونس: ۱۲)

''پھر جب ہم اس کی تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے اپنی اس تکلیف میں کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کی ایک ایسی حالت کا بیان کیا ہے کہ جب وہ تکلیف آنے پر اللہ کو یاد کرنے لگتا ہے اور ایسے وقت میں وہ صرف اللہ ہی کو پکارتا ہے' کسی شرک یا کفر کا ارتکاب نہیں کرتا اور جونہی تکلیف رفع ہو جاتی ہے وہ غفلت کا شکار ہو جاتا ہے' اور ایسی حالت میں اس کی مثال اس آیت کے مطابق نظر آتی ہے:

﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ﴾ (التوبۃ: ۱۰۲)

''انہوں نے ملا دیا نیک اعمال کو اور کچھ بُرے اعمال کو۔''

اور یہ قسم ہے ان لوگوں کی جن کے بارے میں پھر کہا گیا:

﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢﴾﴾

گویا ان کی حالت مسرفین کی مانند ہے' اور اہلِ ایمان کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم ایسے مت ہو جانا' بلکہ ایسی حالت سے اللہ کی پناہ مانگنا' اور ہمیشہ سمع واطاعت کا راستہ اپنانا اور اللہ کے سامنے گڑگڑاتے رہنا۔

اور یہاں مسرف کا مطلب یہ ہوسکتا ہے (واللہ اعلم): وہ شخص جو کفریہ اعمال میں تو نہیں بلکہ گناہوں میں اسراف کا مرتکب ہوا ہے۔ البتہ اگر وہ کفریہ اعمال میں اسراف کرے تو اس پر پھر یہ آیت صادق آتی ہے:

﴿وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿٤٣﴾﴾ (المؤمن)

''اور بے شک مسرفین آگ کے ہم نشین ہیں۔''

یعنی سورۃ یونس کی آیت میں بجائے ''کافرین'' کے ''مسرفین'' کا ذکر اس لیے آیا تاکہ اس بات کا امکان باقی رہے کہ یہ انسان کی وہ حالت ہے جو اس وقت طاری ہوتی ہے جب اس پر تکلیف آتی ہے اور پھر رفع ہو جاتی ہے' جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔

اب رہی سورۃ الانعام کی آیت تو اس سے قبل کی آیت ملاحظہ ہو:

﴿كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ﴾

''اس کی مثال بھلا اس شخص کی سی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو' اور اس سے نکل نہ رہا ہو؟''

غور کیجیے' یہاں دو ایسی حالتوں کا بیان ہو رہا ہے جو ایک دوسرے کی انتہا پر ہیں۔ ایک اس شخص کی حالت جو ہالۂ نور میں قدم بڑھا رہا ہے اور دوسرا وہ شخص جو تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے اور ان سے باہر نہیں آنا چاہ رہا۔ یہ وہ دو انتہائی اطراف ہیں جن کے مابین کوئی واسطہ نہیں ہے' اس لیے اگر پہلی حالت ایمان والوں کی ہے تو دوسری حالت کفر والوں کی ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مسرف کا اطلاق تاریکیوں میں گھرے شخص سے کمتر درجے پر ہوگا کہ اس کے لیے امید کا چراغ باقی نظر آتا ہے' کیونکہ اس کی حالت کافر جیسی نہیں ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الزمر:۵۳)

''کہہ دیجیے' اے میرے بندو! کہ جنہوں نے اپنی جانوں پر اسراف کیا ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔''

اب کہاں یہ حالتِ اسراف کہ جہاں امید کی لو بھڑک رہی ہے اور کہاں کفر کے گڑھے میں پڑا ہوا وہ شخص جو تاریکیوں سے نکلنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اور یوں واضح ہو گیا کہ یہ دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر خوب مناسبت رکھتی ہیں اور اگر اس کے برعکس ہوتا تو قطعاً غیر مناسب ہوتا۔ واللہ اعلم!

(۱۱۶) آیت ۱۳۱:

﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾﴾

''اور یہ اس لیے کہ آپ کا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے جبکہ وہ (حق سے) بے خبر ہوں۔''

اور سورۃ ھود میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾

''اور آپ کا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر دے جبکہ وہاں کے لوگ نیکوکار ہوں۔''

تو پہلی آیت میں لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ غافل تھے اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ وہ مصلح (نیکوکار) تھے' تو اس فرق کی وجہ کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الانعام کی اس آیت سے ماقبل ارشاد فرمایا:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ

يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ﴾ (آیت ۱۳۰)

''اے جن اور انس کی جماعتو! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر میری آیات پڑھ پڑھ کر سناتے تھے اور تمہیں آج کے اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟''

اللہ تعالیٰ کا عذاب دینے کے بارے میں ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾﴾ (الاسراء)

''اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں۔''

اور اسی سنت کی طرف ان آیات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے:

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ﴾ (المائدۃ:۱۹)

''کہیں تم یہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی بشارت دینے والا آیا تھا اور نہ ہی کوئی ڈرانے والا' تو (دیکھ لو) تمہارے پاس بشیر اور نذیر آ چکا ہے۔''

تو انہیں بغیر کسی مقصد کے نہیں پیدا کیا گیا۔ اور اگر حجت قائم کر دی جائے تو پھر غفلت کے شکار شخص کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہے گا۔ اور یہی مضمون ہے سورۃ الانعام کی آیت کا: ﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾﴾ اور ایسا کہنا یہاں بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اب آیئے سورۃ ھود کی آیت کی طرف' کہ اس سے قبل ارشاد فرمایا:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۱۶)

''پھر کیوں نہ تم سے پہلے زمانے کے لوگوں میں ایسے چند اہل خیر ہوئے جو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے' سوائے ان چند لوگوں کے جنہیں ہم نے ان میں سے نجات دی تھی۔''

اگر وہ فساد برپا کرنے سے روکنے والے ہوتے تو وہ مصلح کہلاتے اور عذاب کے مستحق نہ ٹھہرتے۔ اور اسی بات کو اگلی آیت میں واضح کر دیا:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾

تو یہاں ''مُصْلِحُوْن'' کا لانا مناسب تھا' جیسے سورۃ الانعام کی آیت میں ''غَافِلُوْن'' کا لانا مناسب تھا۔ اور اگر اس کا الٹ کیا جاتا تو قطعاً مناسب نہ تھا۔

اب رہا ان دو صیغوں کا فرق کہ سورۃ الانعام کی آیت میں ''مُهْلِك'' بصیغہ اسم فاعل ہے اور سورۃ ہود کی آیت ''لِيُهْلِكَ'' بصیغہ لام جحود (بمعنی انکار) ہے تو اس فرق کو ہم سورۂ ہود کے ضمن میں واضح کریں گے۔

(۱۱۷) **آیت ۱۳۵:**

﴿قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ.....﴾

''کہہ دیجیے اے میری قوم! تم اپنی جگہ کام کرتے رہو' میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں' اور عنقریب تم

(انجام کار) جان لو گے.....''

اور ایسے ہی سورۃ الزمر (آیت ۲۹) میں ارشاد فرمایا۔ اور سورۂ ھود کی آیت ۹۳ میں شعیب علیہ السلام کے قصے کے ضمن میں فرمایا:

﴿وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ.....﴾

''اور اے میری قوم کے لوگو! اب تم اپنی جگہ عمل کیے جاؤ' میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ تم عنقریب جان لو گے.....''

مضمون بالکل وہی ہے' صرف اتنا فرق ہے کہ پہلی آیت میں ''فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'' فرمایا۔ یعنی حرفِ تسویف (جہاں سَوْفَ لایا جائے) سے قبل فائے تعقیب ہے (یعنی یہ بتایا جا رہا ہے کہ بعد میں کیا ہوگا)۔ جبکہ سورۃ ہود کی آیت میں حرفِ تسویف سے پہلے فائے تعقیب کو نہیں لایا گیا' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الانعام اور سورۃ الزمر کی دونوں آیات میں کفارِ عرب مخاطب ہیں۔ یہاں نبی ﷺ کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ اپنی قوم کو خبردار کرنے کے انداز میں حکم دیں کہ اچھا! تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے کہا گیا:

﴿قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ.....﴾ (ابراھیم: ۳۱)

''کہہ دیجیے میرے ان بندوں کو جو ایمان لائے کہ وہ نماز کو قائم کریں.....''

اور اس اندازِ تخاطب میں شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے' اور عربی زبان میں شرط کے جواب میں فائے تعقیب کو لایا جاتا ہے' اس لیے ''فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'' فرمایا۔

اب رہی سورۃ ہود کی آیت تو اس میں شعیب علیہ السلام کا وہ قول نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنی اُمت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ گو اس میں بھی قوم کے لیے حکم نامہ تھا' لیکن یہ قول ہمارے نبی ﷺ کے لیے صرف ایک خبر کی حیثیت رکھتا ہے' اس لیے یہاں شرط کو مقدر ماننا اتنا جچتا نہیں ہے' چنانچہ فائے تعقیب کو نہیں لایا گیا۔ واللہ اعلم!

(۱۱۸) آیت ۱۴۸:

﴿سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ.....﴾

''عنقریب جن لوگوں نے شرک کیا تھا وہ کہیں گے: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ (دادے) اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ اور ایسے ہی ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے گزر چکے تھے.....''

اور سورۃ النحل کی آیت ۳۵ میں ارشاد فرمایا:

﴿لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ﴾

''اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہی ہمارے آباء (و اَجداد) اسے چھوڑ کر کسی کی عبادت کرتے اور نہ ہی اس

کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ اور ایسے ہی ان لوگوں نے کیا تھا جو ان سے پہلے تھے۔''

ان دونوں آیات میں مشابہت کے باوجود چند الفاظ کا فرق ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الانعام کی آیات میں بنی اسرائیل کا تذکرہ تھا اور ان چیزوں کا جو ان پر حرام قرار دی گئی تھیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ﴾ (آیت ۱۴۶)

''اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے۔''

اور پھر بعد میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ﴾ (آیت ۱۵۰)

''کہہ دیجیے اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے!''

گو یہ خطاب مشرکین سے ہے' لیکن چونکہ اس سے قبل بنی اسرائیل کا ذکر آ چکا ہے اس لیے وہ بھی اس کے مخاطب ہیں کہ انہوں نے اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں میں تبدیلی بھی کی اور تحریف بھی کی' اور مذکورہ آیت (یعنی آیت ۱۴۸) ان آیات میں ایسے وارد ہوئی ہے جیسے جملہ معترضہ ہوتا ہے' یعنی بات ایک خاص موضوع پر ہو رہی ہو اور بیچ میں کسی مناسبت کی بنا پر ایک جملے کا اضافہ کر دیا جائے' اور ایسے موقع پر جملہ معترضہ میں اختصار ملحوظ ہوتا ہے نہ کہ طوالت۔

اور جہاں تک سورۃ النحل کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں غیر عرب سے' چاہے وہ مؤمن ہوں یا کافر' خطاب نہ تھا' بلکہ انہیں ہی نصیحت کی جا رہی تھی' انہیں اپنی نعمتوں اور احسانات کی یاد دہانی کرائی جا رہی تھی' اور مناسب تھا کہ پھر کلام میں طوالت ہوتی' اس لیے یہ آیت سورۃ الانعام کی آیت کے مقابلے میں زیادہ کلمات رکھتی ہے۔

ایک دفعہ پھر ملاحظہ ہو:

﴿لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ﴾

اور یوں ہر آیت اپنے مقام پر نگینہ کی طرح جڑی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم!

(۱۱۹) آیت ۱۵۱:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ﴾

''کہہ دیجیے' آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا حرام کیا ہے؟ وہ یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ' اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو' اور اپنی اولاد کو فقر و فاقے کے (ڈر سے) ہلاک نہ کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔''

اور سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ﴾ (آیت ۳۱)

''اور اپنی اولاد کو فقر و فاقے کے ڈر سے ہلاک نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔''

ان دونوں آیات میں دو جگہ فرق پایا جاتا ہے جب کہ مقصود واحد ہے۔ پہلی آیت میں صرف ''مِنْ اِمْلَاقٍ'' اور دوسری میں ''خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ'' کہا گیا' اسی طرح پہلی آیت کے آخر میں ضمیر مخاطب (نَرْزُقُكُمْ) پہلے ہے اور اولاد سے متعلق ضمیر (وَاِيَّاهُمْ) بعد میں ہے' جب کہ دوسری آیت میں اس کے برعکس ہے' یعنی اولاد سے متعلق ضمیر پہلے ہے اور ضمیر مخاطب بعد میں ہے۔

اس فرق کی وضاحت کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ سورۃ الانعام کی آیت میں وہ لوگ مخاطب ہیں جو فقر و فاقہ میں اصلاً مبتلا تھے اور اسی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے' تو انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تم رازق نہیں ہو' رازق تو ہم ہیں' اور ہم تمہیں بھی روزی پہنچانے والے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ اس لیے ان کے قتل سے باز آؤ' بلکہ یوں سمجھو کہ تمہاری اولاد کی وجہ سے تمہیں بھی رزق رسانی ہو رہی ہے۔

اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں عرب کے کفار مخاطب ہیں جو اپنی بیٹیوں کو اس ڈر سے قتل کر دیا کرتے تھے کہ انہیں کہاں سے کھلائیں گے' یعنی فقر و فاقے کے اندیشے سے انہیں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے' اور اس بنا پر یہاں اولاد کو رزق بہم پہنچانے کا ذکر پہلے کیا گیا۔ گویا انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تم مستقبل میں فقر و فاقے کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو' اس لیے کہ انہیں رزق دینے والے ہم ہیں' اور چونکہ یہ بات زیادہ ضروری تھی اس لیے رزقِ اولاد کا ذکر پہلے کیا گیا اور رزقِ آباء کا ذکر بعد میں کیا گیا' واللہ اعلم۔

(۱۲۰) آیت ۱۵۱:

﴿ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾

''یہ وہ باتیں ہیں جن کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔''

اور اس سے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾﴾ ''تاکہ تم نصیحت حاصل کر پاؤ''۔ اور اس سے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾﴾ ''تاکہ تم متقی بن سکو۔''

تو آخر ان تینوں آیات کے اختتامی الفاظ میں یہ اختلاف کیوں ہے؟

جواباً عرض ہے کہ پہلی آیت میں پانچ حرام چیزوں کا بیان ہوا ہے اور وہ ہیں: شرک کرنا' والدین سے بُرا سلوک کرنا' فقر کی بنا پر اولاد کو قتل کرنا' بے حیائی کے کام کرنا اور ناحق کسی کو قتل کرنا۔ یہ وہ پانچ چیزیں ہیں جن کی قباحت ہر عقل مند شخص کے لیے آشکار ہے۔ گو ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار صرف عقل ہے' بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اصل میں تو شریعت ہی بتاتی ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا ہے' لیکن عقل بھی شریعت کے حسن اور قبح کی تائید کرے گی اور اسی لیے یہاں ''لَعَلَّ'' کا لفظ لایا گیا جسے امید کے لیے لایا جاتا ہے۔ گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ یہ باتیں ساری کی ساری قبیح ہیں' اور اگر تم سمجھ نہیں پا رہے ہو تو ذرا اپنی عقل سے کام لو' وہ بھی ان کی قباحت ہی بیان کرے گی۔ اس کے بعد چار احکامات بیان ہوئے: یتیم کا مال نہ کھاؤ' ناپ تول

پورا کرو‘ بات کرو تو انصاف کی بات کرو‘ اور اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرو۔ اب یہ باتیں وہ ہیں کہ جن میں انسان کی خواہشات اور لذّتِ نفس کا دخل ہے‘ اور جہاں یہ آ جائیں تو انسان اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے‘ اس لیے یہاں ارشاد فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ ’’شاید کہ تم نصیحت حاصل کر پاؤ‘‘۔ اور وہ اس لیے کہ جو نصیحت قبول کر لیتا ہے تو وہ صاحبِ بصیرت بن جاتا ہے‘ اور پھر سمجھدار بھی ہو جاتا ہے اور یوں وہ غلط کاموں سے باز آ جاتا ہے۔ اسی بات کو اس آیت میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف)

’’بے شک جو لوگ متقی ہیں جب شیطان انہیں اپنے وسوسوں کا نشانہ بناتا ہے تو وہ نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں اور پھر ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (بصارت اور بصیرت دونوں حاصل ہو جاتی ہیں)۔‘‘

اب یہ ساری کی ساری باتیں تمام شریعتوں کا جزو رہی ہیں‘ ان میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا‘ اور جو ان پر عمل پیرا ہوا تو وہ اس سیدھے راستے پر گامزن ہو گیا جس میں نہ کوئی کجی ہے نہ کوئی اونچ نیچ‘ اور ایسا شخص اپنے بچاؤ کے لیے بہترین راستے کا اختیار کرنے والا ہوتا ہے۔ اسی لیے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ﴾ (آیت ۱۵۳)

’’اور بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اسے اختیار کرو۔‘‘

اور یہ حکم تمام مخلوقات کے لیے ہے۔ اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ﴾ (آیت ۱۵۳)

’’اور (دوسرے) راستے اختیار نہ کرو کہ وہ تمہیں اُس کے (سیدھے) راستے سے ہٹا دیں گے۔‘‘

اور پھر یہ اختتامی کلمات وارد ہوئے:

﴿ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

’’اور تمہیں ان باتوں کا اس نے حکم دیا ہے تاکہ تم بچ سکو۔‘‘

خیال رہے کہ تقویٰ کا مفہوم ہی یہی ہے کہ انسان بدانجام سے بچنے کا سامان مہیا کرے‘ اور تینوں آیات کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص عقل سے کام لے‘ نصیحت پکڑتا رہے تو وہی دراصل متقی ہے‘ اور متقی افراد ہی کامیاب و کامران رہتے ہیں۔ (سبحان اللہ!)

(۱۲۱) آیت ۱۶۳:

﴿وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ’’اور میں مسلمانوں میں پہلا ہوں۔‘‘

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ’’اور میں مؤمنوں میں پہلا ہوں۔‘‘

تو ان دونوں میں فرق کیوں روا رکھا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے‘ واللہ اعلم‘ کہ اس آیت سے قبل یہ کہا گیا:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴿۱۶۱﴾﴾

''کہہ دیجیے کہ مجھے میرے رب نے ایک سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کی ہے' جو کہ ایک راست دین ہے' جو طریقہ ہے ابراہیمؑ کا جو (اللہ کی طرف) یکسو تھے' اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔''

اور یہی صفات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بیان ہوئیں:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴿۶۷﴾﴾

(آل عمران)

''حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی' بلکہ وہ تو یک سو ہو کر خالص مسلمان تھے' اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔''

اور یہی وصیت انہوں نے اپنی اولاد کو کی:

﴿یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۳۲﴾﴾ (البقرة)

''اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے دین کو چُن لیا ہے' تو اب تمہیں موت نہ آئے مگر اسلام کی حالت میں۔''

اور یہی وصیت یعقوب علیہ السلام کی اپنی اولاد کے لیے تھی۔ فرمایا:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ﴾

''کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوبؑ بستر مرگ پر تھے' جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟''

﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴿۱۳۳﴾﴾ (البقرة)

''انہوں نے کہا: ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے آباء ابراہیم' اسماعیل' اسحٰق کے معبود کی جو کہ ایک ہی معبود ہے' اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو ان کی اقتداء کا حکم دیا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ﴾ (الانعام: ۹۰)

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے' تو تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔''

اب گویا اسی حکم کا جواب آ رہا ہے:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ﴾

اور پھر آپ ﷺ کی بات یہاں ختم ہوتی ہے:

﴿وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴿۱۶۳﴾﴾

ان آیات میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے رسولوں اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہو رہا ہے جو ملتِ

ابراہیمی کے پیروکار تھے' اور پھر ایک عرصہ دراز کے بعد نبی اکرم ﷺ کا ظہور ہوتا ہے اور وہ قولی اور عملی طور پر اس ہدایت آسمانی کی اقتداء کرتے نظر آتے ہیں۔ لفظ اسلام ظاہری اور باطنی دونوں طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کے سامنے جھک جانے کا نام ہے اور اس لحاظ سے ایمان بمعنی تصدیق اسلام کے اندر داخل ہے۔ اور یوں نبی ﷺ کی زبان سے ادا کردہ یہ اقرار اسلام اور ایمان کی کامل ترین صورت کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے کہ جس پر اللہ کے یہ منتخب صالح افراد فائز تھے' یعنی یہ تمام لوگ اس کامل ہدایت کی صف اول کے لوگ تھے —— اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے —— اور اس لحاظ سے یہاں آیت کے اختتام پر ''اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ'' کہنا بالکل مناسب تھا۔

اور جہاں تک سورۃ الاعراف کی آیت کا تعلق ہے کہ جہاں ''اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ'' کہا گیا ہے تو یہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ادا کیا گیا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی طلب کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ ایسی طلب کرنا جائز ہے' محال نہیں ہے' اور نبی کی شان سے یہی توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ جائز چیز کی ہی طلب کرے گا' ناممکن چیز کی نہیں۔ انہوں نے جب اس معاملے میں جلد بازی کی اور دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا: ''لَنْ تَرَانِیْ'' (تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے) یعنی اس دنیا میں' اور پھر انہیں ہدایت کی کہ وہ پہاڑ کی طرف دیکھیں' اور جب انہوں نے پہاڑ کی طرف دیکھا تو ایک عظیم نشانی کا ظہور ہوا اور وہ یہ کہ پہاڑ اللہ کی تجلی کو برداشت نہ کر سکا اور چورا چورا ہو گیا اور خود موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے' اور جونہی انہیں ہوش آیا تو ان کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ﴿سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ﴾ ''تو پاک ہے' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں''۔ اور یہاں کسی گناہ سے توبہ کرنا مراد نہیں ہے اور نہ ہی رب کے بارے میں کسی طرح کی بھی ناواقفیت سے کہ کیا اس کے لیے جائز ہے اور کیا ناجائز' اس لیے کہ انبیاء بخوبی جانتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز' بلکہ ان کا مطلب تو یہ تھا کہ میں اس کوتاہی سے تائب ہوتا ہوں کہ میں نے اس چیز کے بارے میں جلد بازی کی جو فی الجملہ تو جائز ہی تھی' اور پھر '' وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ '' کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ میں اس بات کی سب سے پہلے تصدیق کرتا ہوں کہ آپ کا دیدار اس دنیا میں حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں ''اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ'' کہنا اس لیے مناسب نہ تھا کہ مذکورہ تمام انبیاء کی طرح یہ وصف تو انہیں پہلے سے حاصل تھا۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ دونوں عبارتیں سیاق وسباق کے اعتبار سے اپنی اپنی جگہ ہی مناسب ہیں اور ان کا الٹ قطعاً غیر مناسب ہوتا۔ واللہ اعلم!

(۱۲۲) آیت ۱۶۵:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا ہے۔''

اور اسی طرح سورۃ فاطر میں ارشاد فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ (آیت ۳۹)

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔''

سوال یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین کی طرف خلافت کی اضافت کی گئی ہے جبکہ دوسری آیت میں ''فِی الْاَرْضِ'' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ زمین وہ جگہ ہے جہاں یہ خلافت نصیب ہوگی' تو اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ جواباً عرض ہے کہ سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت سے قبل ہدایت ربانی جیسی عظیم نعمت کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ﴾ (آیت ۱۶۱)

''کہہ دیجیے کہ میرے رب نے مجھے سیدھے راستے کی طرف ہدایت کی ہے۔''

اور پھر اس سے اگلی دونوں آیات میں صراطِ مستقیم کی مزید وضاحت آئی ہے۔ یہاں تک کہ نبی ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے:

﴿قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ﴾ (آیت ۱۶۴)

''کہہ دیجیے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور رب کو چاہوں جبکہ وہ ہر چیز کا رب ہے؟''

اور یوں واضح کر دیا کہ ہر چیز کا مالک وہی ہے اور ہر چیز پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ یہاں عمومیت کا تقاضا تھا کہ بندوں پر اس کے اس انعام کا بھی تذکرہ کیا جاتا کہ اللہ نے انہیں زمین کا خلیفہ بھی بنایا ہے۔

(خلیفہ ان معنوں میں کہ ایک قوم کو اقتدار نصیب ہوتا ہے اور پھر اس کے زوال کے بعد ایک دوسری قوم اس کی جانشین بنتی ہے' اور ایسے ہی اگر ایک فرد اقتدار کے منصب پر قائم ہوتا ہے تو اس کے جانے کے بعد ایک دوسرا شخص اس کا جانشین بنتا ہے۔ اور انہی معنوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ کے رسول ﷺ کا خلیفہ قرار دیا گیا: مترجم)

اور یہاں اگر ''فِی الْاَرْضِ'' کہا جاتا تو وہ وسعت اور عموم نہ پیدا ہوتا جو کہ اضافت سے حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ ''فِی الْاَرْضِ'' سے یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ زمین خلافت کی جگہ ہے' لیکن کیا ساری زمین یا زمین کا ایک حصہ؟ دونوں کا احتمال ہو سکتا ہے۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ ''رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ'' میں عموم ہے تو اس کی مناسبت سے جب اللہ تعالیٰ کے انعام کا تذکرہ ہوا تو اس میں بھی عموم ہی کی رعایت رکھی گئی۔

اور جہاں تک سورۃ الملائکہ (سورۃ فاطر) کی آیت کا تعلق ہے تو اس سے قبل کفار کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا یُقْضٰی عَلَیْهِمْ فَیَمُوْتُوْا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے' نہ ان کی قضا آتی ہے کہ وہ مر کھپ جائیں اور نہ ہی ان کے عذاب کو ہلکا کیا جاتا ہے' اور ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلہ دیتے ہیں۔''

﴿وَهُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ

مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ﴾ (آیت ۳۷)

''اور وہ اس میں چیخ چیخ کر دہائیاں دیتے ہیں' اے ہمارے رب! ہمیں نکال باہر کر' ہم نیک اعمال کریں گے' وہ نہیں جو ہم پہلے کیا کرتے تھے۔ کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی کہ جس میں وہ شخص جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا نصیحت حاصل کر سکتا' اور تمہارے پاس ایک ڈرانے والا آ چکا تھا۔''

اور پھر ایک آیت کے بعد مذکورہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ﴾

اور اس کے فوراً بعد کہا:

﴿فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ﴾ (آیت ۳۹)

''اور جو کفر کرتا ہے تو اس کے کفر کا وبال اسی پر ہوگا۔''

ملاحظہ ہو کہ یہ مضمون سورۃ الانعام کی آیت کے مضمون سے بالکل اُلٹ ہے۔ وہاں انعام کا تذکرہ ہے تو زمین کی خلافت (عمومی طور پر) بیان ہوئی' یہاں کفر اور کفار کا تذکرہ ہے تو ''فِي الْاَرْضِ'' کہہ کر اس خلافت کو محدود کر دیا گیا۔ اور یوں ان دونوں آیات کا موقع ومحل واضح ہو گیا۔ واللہ اعلم!

(۱۲۳) آیت ۱۶۵:

﴿اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۡ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾﴾

''بے شک تیرا رب سرعت کے ساتھ بدلہ دینے والا ہے' اور بے شک وہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾﴾

سوال یہ ہے کہ اس آیت میں لفظ ''سَرِیْع'' پر لام تاکید کا اضافہ ہے جبکہ سورۃ الانعام کی آیت میں یہی لفظ بغیر لام تاکید کے ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت سے قبل اللہ کے رسول ﷺ کا تذکرہ ہے' ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ﴾

اور پھر آپ ﷺ کی دعوت اور آپؐ پر کی گئی نوازشوں کا تذکرہ ہے۔ اور آخر میں امت مسلمہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾

یعنی سارے کا سارا خطاب نبی ﷺ اور اُمتِ مُسلمہ سے ہے۔ آخر میں جب یہ کہا گیا کہ: ﴿اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ﴾ کہ جس میں لام تاکید کو نہیں لا گیا تو اس بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ اُمتِ مُسلمہ بحیثیت مجموعی سزا کی مستحق نہیں ہے (باقی صفحہ 39 پر)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب و تدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ التوبۃ

آیات ۴۹ تا ۵۹

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ
بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا
مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ
نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۚ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ
مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝
وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ
اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا
يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَيَحْلِفُوْنَ
بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ
مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا
مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝

ز ھ ق

زَھَقَ یَزْھَقُ (ف) زَھْقًا :روح کا جسم سے نکل جانا' کسی چیز کا مٹ جانا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۵

زَاھِقٌ (اسم الفاعل) :جانے والا' مٹنے والا۔ ﴿فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ﴾ (الانبیاء:۱۸) ''تو جب ہی وہ مٹنے والا ہے۔''

زَھُوْقٌ (فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ) : بے انتہا مٹنے والا' نیست و نابود ہونے والا۔ ﴿اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَھُوْقًا﴾ (الاسراء) ''یقیناً باطل ہے ہی نیست و نابود ہونے والا۔''

ل ج ء

لَجَأَ یَلْجَأُ (ف) لَجْئًا :کسی جگہ میں پناہ لینا۔

مَلْجَأٌ (اسم الظرف) :پناہ لینے کی جگہ۔ زیر مطالعہ آیت ۵۷

ج م ح

جَمَحَ یَجْمَحُ (ف) جَمْحًا :گھوڑے کا سوار کے قابو سے باہر ہونا' سرکش ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۷

ل م ز

لَمَزَ یَلْمِزُ (ض) لَمْزًا :عیب جوئی کرنا' نکتہ چینی کرنا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۸

لُمَزَۃٌ (صفت ہے اور اس پر تائے مبالغہ ہے) : بہت عیب جوئی کرنے والا۔ ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ ھُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (الھمزۃ) ''تباہی ہے ہر ایک غیبت کرنے والے عیب جوئی کرنے والے کی۔''

ترکیب:

(آیت ۴۹) ''لَا تَفْتِنِّیْ'' میں نون ثقیلہ نہیں ہے۔ یہ فعل نہی ''لَا تَفْتِنْ'' ہے اور ضمیر مفعولی ''نِیْ'' کو اس میں ملا کر لکھا گیا ہے۔ (آیت ۵۲) ''بِنَا'' مادہ ''ب ن ی'' کا کوئی صیغہ نہیں ہے' بلکہ ضمیر ''نَا'' پر حرف جارہ ''بِ'' داخل ہوا ہے۔ ''اَلْحُسْنَیَیْنِ، حَسَنٌ'' کا تثنیہ نہیں ہے بلکہ یہ افعل تفضیل ''حُسْنٰی'' کا تثنیہ ہے۔ (آیت ۵۵) ''لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا'' میں ''ھَا'' کی ضمیر ''اَمْوَالُھُمْ'' اور ''اَوْلَادُھُمْ'' کے لیے ہے۔

ترجمہ:

وَمِنْھُمْ مَّنْ :اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو	یَّقُوْلُ : کہتے ہیں
ائْذَنْ لِّیْ : آپؐ اجازت دیں مجھے	وَلَا تَفْتِنِّیْ :اور آپؐ آزمائش میں نہ ڈالیں مجھے
اَلَا :سنو!	فِی الْفِتْنَۃِ : آزمائش میں ہی
سَقَطُوْا :وہ لوگ گرے	وَاِنَّ جَھَنَّمَ :اور یقیناً جہنم
لَمُحِیْطَۃٌ :ضرور گھیرنے والی ہے	بِالْکٰفِرِیْنَ : کافروں کو
اِنْ تُصِبْكَ :اگر آن لگے آپؐ کو	حَسَنَۃٌ :کوئی اچھائی

تَسُؤْهُمْ : تو وہ بری لگتی ہے ان کو
مُصِيْبَةٌ : کوئی مصیبت
قَدْ اَخَذْنَآ : ہم نے پکڑ (یعنی سنبھال) لیا ہے
مِنْ قَبْلُ : اس سے پہلے سے
وَهُمْ : اس حال میں کہ وہ لوگ
قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے
اِلَّا مَا : مگر وہ جو
لَنَا : ہمارے لیے
وَعَلَى اللّٰهِ : اور اللہ پر ہی
الْمُؤْمِنُوْنَ : ایمان لانے والے
هَلْ تَرَبَّصُوْنَ : کیا تم انتظار کرتے ہو
اِلَّآ : سوائے
وَنَحْنُ : اور ہم
بِكُمْ : تمہارے بارے میں
اللّٰهُ : اللہ
مِّنْ عِنْدِهٖٓ : اپنے پاس سے
فَتَرَبَّصُوْٓا : تو انتظار کرو
مُّتَرَبِّصُوْنَ : انتظار کرنے والے ہیں
اَنْفِقُوْا : تم خرچ کرو
اَوْ كَرْهًا : یا ناپسند کرتے ہوئے
مِنْكُمْ : تم سے
قَوْمًا : ایک ایسی قوم جو
وَمَا مَنَعَهُمْ : اور نہیں روکا ان کو
مِنْهُمْ : ان سے
اِلَّآ اَنَّهُمْ : سوائے اس کے کہ انہوں نے
وَبِرَسُوْلِهٖ : اور اس کے رسول کا

وَاِنْ تُصِبْكَ : اور اگر آن لگے آپؐ کو
يَّقُوْلُوْا : تو وہ کہتے ہیں
اَمْرَنَا : اپنا معاملہ
وَيَتَوَلَّوْا : اور وہ لوٹتے ہیں
فَرِحُوْنَ : اترانے والے ہیں
لَّنْ يُّصِيْبَنَآ : ہرگز نہیں لگے گا ہم کو
كَتَبَ اللّٰهُ : لکھا اللہ نے
هُوَ مَوْلٰىنَا : وہ ہمارا کارساز ہے
فَلْيَتَوَكَّلِ : پس چاہیے کہ بھروسہ کریں
قُلْ : آپؐ کہیے
بِنَآ : ہمارے بارے میں
اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ : دو بہترین اچھائیوں میں سے ایک کے
نَتَرَبَّصُ : انتظار کرتے ہیں
اَنْ يُّصِيْبَكُمْ : کہ آن لگے تم لوگوں کو
بِعَذَابٍ : کسی عذاب کے ساتھ
اَوْ بِاَيْدِيْنَا : یا ہمارے ہاتھوں سے
اِنَّا مَعَكُمْ : بے شک ہم تمہارے ساتھ
قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے
طَوْعًا : تابعدار ہوتے ہوئے
لَّنْ يُّتَقَبَّلَ : ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا
اِنَّكُمْ كُنْتُمْ : بے شک تم ہو
فٰسِقِيْنَ : نافرمانی کرنے والی ہے
اَنْ تُقْبَلَ : کہ قبول کیا جائے
نَفَقٰتُهُمْ : ان کے خرچوں کو
كَفَرُوْا بِاللّٰهِ : انکار کیا اللہ کا
وَلَا يَاْتُوْنَ : اور وہ نہیں آتے

الصَّلٰوۃَ :نماز کے پاس
کُسَالٰی :انتہائی کاہل ہیں
اِلَّا وَھُمْ :مگراس حال میں کہ وہ
فَلَا تُعْجِبْكَ : تو چاہیے کہ حیرت میں نہ ڈالیں آپؐ کو
وَلَآ اَوْلَادُھُمْ :اور نہ ہی ان کی اولاد
یُرِیْدُ اللّٰہُ :چاہتا ہے اللہ
بِھَا :ان سے
وَتَزْھَقَ :اور نکلیں
وَھُمْ :اس حال میں کہ وہ
وَیَحْلِفُوْنَ :اور وہ قسمیں کھاتے ہیں
اِنَّھُمْ :کہ وہ
وَمَا ھُمْ :اور وہ نہیں ہیں
وَلٰکِنَّھُمْ :اور لیکن وہ
یَّفْرَقُوْنَ :ڈرتے ہیں
مَلْجَاً :کوئی پناہ گاہ
اَوْ مُدَّخَلاً :یا کوئی گھسنے کی جگہ
اِلَیْہِ :اس کی طرف
یَجْمَحُوْنَ :سرکشی کرتے ہوں
یَّلْمِزُكَ :نکتہ چینی کرتے ہیں آپؐ پر
فَاِنْ :پھر اگر
مِنْھَا :ان میں سے
وَاِنْ :اور اگر
مِنْھَآ :ان میں سے
یَسْخَطُوْنَ :غصہ کرتے ہیں
رَضُوْا :راضی ہوتے
اللّٰہُ :اللہ نے

اِلَّا وَھُمْ :مگراس حال میں کہ وہ
وَلَا یُنْفِقُوْنَ :اور وہ خرچ نہیں کرتے
کٰرِھُوْنَ :کراہیت کرنے والے ہیں
اَمْوَالُھُمْ :ان کے اموال

اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
لِیُعَذِّبَھُمْ : کہ وہ عذاب دے ان کو
فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا :دنیوی زندگی میں
اَنْفُسُھُمْ :ان کی جانیں
کٰفِرُوْنَ :کفر کرنے والے ہوں
بِاللّٰہِ :اللہ کی
لَمِنْکُمْ :ضرور تم میں سے ہیں
مِّنْکُمْ :تم میں سے
قَوْمٌ :ایک ایسی قوم ہیں جو
لَوْ یَجِدُوْنَ :اگر وہ پائیں
اَوْ مَغٰرٰتٍ :یا کچھ غار
لَّوَلَّوْا : تو ضرور لوٹیں گے
وَھُمْ :اس حال میں کہ وہ
وَمِنْھُمْ مَّنْ :اور ان میں وہ بھی ہیں جو
فِی الصَّدَقٰتِ :صدقات (کے بارے) میں
اُعْطُوْا :عطا کیا جائے ان کو
رَضُوْا :تو وہ راضی ہوں
لَّمْ یُعْطَوْا :عطا نہ کیا جائے ان کو
اِذَا ھُمْ :تو جب ہی وہ
وَلَوْ اَنَّھُمْ :اور اگر یہ کہ وہ لوگ
مَآ اٰتٰىھُمُ :اس سے جو دیا ان کو
وَرَسُوْلُہٗ :اور اس کے رسول نے

وَقَالُوْا :اور وہ کہتے	حَسْبُنَا اللّٰهُ :کافی ہے ہم کو اللہ
سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ :دے گا ہم کو اللہ	مِنْ فَضْلِهٖ :اپنے فضل سے
وَرَسُوْلُهٗٓ :اور اس کا رسول بھی	اِنَّآ :بے شک ہم
اِلَى اللّٰهِ :اللہ کی طرف ہی	رٰغِبُوْنَ :رغبت کرنے والے ہیں

نوٹ: آیت ۵۵ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو مال و دولت سے اس دنیا میں بھی عذاب دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں انہماک انسان کے لیے اس دنیا ہی میں ایک عذاب اور مصیبت بن جاتا ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی محنت و مشقت اور جسمانی و جذباتی کوفت اٹھانی پڑتی ہے کہ نہ دن کا چین نہ رات کی نیند، نہ اپنے تن بدن کی خبر اور نہ اپنے بیوی بچوں میں دل بہلانے کی فرصت۔ پھر اگر دولت حاصل ہو گئی تو اس کو بڑھانے کی فکر بھی دن رات کا ایک عذاب ہے اور اگر ذرا سا نقصان ہو جائے تو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور اگر ساری چیزیں خواہش کے مطابق حاصل ہو جائیں تو اس کے گھٹ جانے کا اندیشہ ایک مستقل عذاب ہے۔ یہ سب عذاب ہی عذاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیوقوف انسان نے راحت کے سامان کو ہی راحت سمجھ لیا ہے اور حقیقی راحت یعنی قلبی سکون و اطمینان کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لیے وہ سامانِ راحت کو ہی راحت سمجھ کر اس میں مگن رہتا ہے، جو حقیقت میں اس کے لیے دنیا کے چین و آرام کا بھی دشمن ہے اور آخرت کے عذاب کا مقدمہ بھی ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۶۰ تا ۶۶

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝
وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا
مُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ
الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ
اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ
وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

غ ر م

غَرِمَ یَغْرَمُ (س) غَرْمًا: (۱) کسی چیز کا کسی سے چمٹ جانا۔ (۲) کسی جرم یا غلطی کے بغیر نقصان میں پھنسنا' مفت کے تاوان میں پڑنا۔

غَرَامٌ (اسم ذات): چمٹ جانے والی چیز۔ ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝۶۵﴾ (الفرقان) ''بے شک اس کا عذاب چمٹنے والی چیز ہے۔''

مَغْرَمٌ (اسم الظرف کا وزن مَفْعَلٌ ہے' لیکن اسم ذات کے طور پر استعمال ہوتا ہے): تاوان' چٹی۔ ﴿وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا﴾ (التوبۃ:۹۸) ''اور دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو بناتے ہیں یعنی سمجھتے ہیں اس کو جو وہ خرچ کرتے ہیں ایک چٹی۔''

غَارِمٌ (اسم الفاعل): تاوان میں پھنسنے والا۔ زیر مطالعہ آیت ۶۰

اَغْرَمَ (افعال) اِغْرَامًا: کسی پر تاوان ڈالنا۔

مُغْرَمٌ (اسم المفعول): تاوان ڈالا ہوا۔ ﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝۶۶﴾ (الواقعۃ) ''بے شک ہم ضرور تاوان ڈالے گئے ہیں۔''

ترکیب:

(آیت ۶۰) ''اَلْمَسٰكِيْنِ، اَلْعٰمِلِيْنَ، اَلْمُؤَلَّفَةِ، اَلْغٰرِمِيْنَ'' اور ''اِبْنِ السَّبِيْلِ'' یہ سب ''لِلْفُقَرَاءِ'' کے حرف جر ''لِ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے حالتِ جر میں ہیں۔ ''اَلْمُؤَلَّفَةِ'' اسم المفعول نے فعل کا عمل کیا ہے اور ''قُلُوْبُهُمْ'' اس کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے حالتِ رفع میں ہے۔ (آیت ۶۱) ''اُذُنُ'' مضاف اور ''خَيْرٍ'' اس کا مضاف الیہ ہے۔ ''يُؤْمِنُ'' کی ضمیر فاعلی ''النَّبِيَّ'' کے لیے ہے۔ (آیت ۶۲) ''اَنْ يُّرْضُوْهُ'' میں ضمیر مفعولی واحد لا کر ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ کا حق اور اس کے رسولؐ کا حق ایک ہی بات ہے۔ (آیت ۶۳) ''اَنَّهٗ'' ضمیر الشان ہے۔ (آیت ۶۴) ''عَلَيْهِمْ'' اور ''تُنَبِّئُهُمْ'' میں ''هُمْ'' کی ضمیریں مؤمنوں کے لیے ہیں جبکہ ''قُلُوْبِهِمْ'' میں هُمْ کی ضمیر منافقوں کے لیے ہے۔

ترجمہ:

اِنَّمَا: کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	الصَّدَقٰتُ: صدقات
لِلْفُقَرَآءِ: فقیروں کے لیے ہیں	وَالْمَسٰكِيْنِ: اور مسکینوں کے لیے ہیں
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا: اور اس پر کام کرنے والوں کے لیے ہیں	وَالْمُؤَلَّفَةِ: اور جوڑا ہوا ہونے کے لیے ہیں
قُلُوْبُهُمْ: ان کے دلوں کو	وَفِي الرِّقَابِ: اور گردنوں (کو چھڑانے) میں

وَالْغٰرِمِيْنَ :اور تاوان میں پھنسنے والوں کے لیے ہیں

وَابْنِ السَّبِيْلِ :اور مسافروں کے لیے ہیں

مِّنَ اللّٰهِ :اللہ (کی طرف) سے

عَلِيْمٌ :جاننے والا ہے

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ :اور ان میں وہ بھی ہیں جو

النَّبِيَّ :ان نبی (ﷺ) کو

هُوَ :وہ

قُلْ :آپؐ کہیے

لَّكُمْ :تمہارے لیے

بِاللّٰهِ :اللہ پر

لِلْمُؤْمِنِيْنَ :مؤمنوں کی

لِّلَّذِيْنَ :ان کے لیے جو

مِنْكُمْ :تم میں سے

يُؤْذُوْنَ :ایذا پہنچاتے ہیں

لَهُمْ :ان کے لیے

يَحْلِفُوْنَ :وہ قسم کھاتے ہیں

لَكُمْ :تم سے

وَاللّٰهُ :حالانکہ اللہ

اَحَقُّ :زیادہ حق دار ہیں

اِنْ كَانُوْا :اگر وہ ہیں

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا :کیا انہوں نے نہیں جانا

مَنْ يُّحَادِدِ :جو مخالفت کرتا ہے

وَرَسُوْلَهٗ :اور اس کے رسولؐ کی

نَارَ جَهَنَّمَ :جہنم کی آگ ہے

فِيْهَا :اس میں

الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ :بڑی رسوائی ہے

وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :اور اللہ کی راہ میں (خرچ) کے لیے ہیں

فَرِيْضَةً :فرض ہوتے ہوئے

وَاللّٰهُ :اور اللہ

حَكِيْمٌ :حکمت والا ہے

يُؤْذُوْنَ :ایذا پہنچاتے ہیں

وَيَقُوْلُوْنَ :اور وہ کہتے ہیں

اُذُنٌ :ایک کان ہیں

اُذُنُ خَيْرٍ :خیر کا کان ہے

يُؤْمِنُ :وہؐ ایمان رکھتے ہیں

وَيُؤْمِنُ :اور وہؐ بات مانتے ہیں

وَرَحْمَةٌ :اور رحمت ہیں

اٰمَنُوْا :ایمان لائے

وَالَّذِيْنَ :اور وہ لوگ جو

رَسُوْلَ اللّٰهِ :اللہ کے رسولؐ کو

عَذَابٌ اَلِيْمٌ :ایک دردناک عذاب ہے

بِاللّٰهِ :اللہ کی

لِيُرْضُوْكُمْ :تاکہ وہ راضی کریں تم کو

وَرَسُوْلُهٗٓ :اور اس کا رسولؐ

اَنْ يُّرْضُوْهُ :کہ وہ راضی کریں ان کو

مُؤْمِنِيْنَ :ایمان لانے والے

اَنَّهٗ :کہ حقیقت یہ ہے کہ

اللّٰهَ :اللہ کی

فَاَنَّ لَهٗ :تو یہ کہ اس کے لیے

خَالِدًا :ہمیشہ رہنے والا ہوتے ہوئے

ذٰلِكَ :یہ

يَحْذَرُ :ڈرتے ہیں

الْمُنٰفِقُوْنَ : منافق لوگ	اَنْ تُنَزَّلَ : کہ اتاری جائے
عَلَيْهِمْ : ان (مؤمنوں) پر	سُوْرَةٌ : کوئی سورہ
تُنَبِّئُهُمْ : جوخبر دے ان کو	بِمَا : اس کی جو
فِيْ قُلُوْبِهِمْ : ان (منافقوں) کے دلوں میں ہے	قُلِ : آپؐ کہیے
اسْتَهْزِءُوْا : مذاق اڑالو	اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ
مُخْرِجٌ : نکالنے والا ہے	مَّا تَحْذَرُوْنَ : اس کو جس سے تم ڈرتے ہو
وَلَئِنْ : اور بے شک اگر	سَاَلْتَهُمْ : آپؐ پوچھیں ان سے
لَيَقُوْلُنَّ : تو یہ لازماً کہیں گے	اِنَّمَا : کچھ نہیں
كُنَّا نَخُوْضُ : ہم تو بس گپ شپ کرتے تھے	وَنَلْعَبُ : اور کھیلتے تھے
قُلْ : آپؐ کہیے	اَبِاللّٰهِ : کیا اللہ سے
وَاٰيٰتِهٖ : اور اس کی آیات سے	وَرَسُوْلِهٖ : اور اس کے رسولؐ سے
كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ : تم استہزاء کرتے تھے	لَا تَعْتَذِرُوْا : بہانے مت تراشو
قَدْ كَفَرْتُمْ : تم لوگ کفر کر چکے ہو	بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ : اپنے ایمان کے بعد
اِنْ نَّعْفُ : اگر ہم درگزر کریں	عَنْ طَآئِفَةٍ : کسی جماعت سے
مِّنْكُمْ : تم میں سے	نُعَذِّبْ : تو ہم عذاب دیں گے
طَآئِفَةً : کسی جماعت کو	بِاَنَّهُمْ : بسبب اس کے کہ وہ
كَانُوْا : تھے	مُجْرِمِيْنَ : جرم کرنے والے

نوٹ : آیت ۶۰ وہ بنیادی آیت ہے جس سے زکوٰۃ کے احکام وضع کیے گئے ہیں' اس کی تفصیل مختلف تفاسیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں ہم صرف چند اہم نکات کی نشاندہی کر رہے ہیں جو ہم نے ''معارف القرآن'' سے اخذ کیے ہیں:

(۱) اگرچہ قرآن مجید کی آیات میں صدقات کا لفظ عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے' جس میں واجب یعنی زکوٰۃ اور نفلی یعنی خیرات' دونوں طرح کے صدقات شامل ہیں' مگر اس آیت میں باجماعِ صحابہؓ وتابعینؒ صدقاتِ فرض یعنی زکوٰۃ ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے۔ نفلی صدقات میں روایات کی تصریحات کی بنا پر بہت وسعت ہے اور وہ ان آٹھ مصارف میں منحصر نہیں ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔

(۲) ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زکوٰۃ میں سے کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا تو آپؐ نے اسے جواب دیا کہ صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حوالہ نہیں کیا' بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصارف

متعین فرما دیے ہیں۔ اگر تم ان میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔ (اس سے ثابت ہو گیا کہ زکوٰۃ کے مصارف کے ضمن میں ''اجتہاد'' کا دروازہ ہمیشہ سے بند ہے۔ روشن خیال اور ترقی پسند مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی بُرا لگے۔ مرتب)

زکوٰۃ کے مصارف معیّن کرنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے زکوٰۃ کے نصاب اور ہر نصاب میں سے مقدارِ زکوٰۃ ہمیشہ کے لیے متعین کر کے بتا دیے اور آپ ﷺ نے اسے صرف زبانی بتانے پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ اس کے مفصّل فرمان لکھوا کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائے۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''ہر مذہب والے پر صدقہ کرو'' اس لیے نفلی صدقات غیر مسلموں کو بھی دیے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ کی یہ ہدایت بھی ہے کہ ''زکوٰۃ صرف مسلمانوں کے اغنیاء سے لی جائے اور ان ہی کے فقراء پر صرف کی جائے''۔ اس لیے زکوٰۃ غیر مسلموں کو نہیں دی جا سکتی۔

(۴) آج کل اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات، زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں، ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے۔ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے۔ زکوٰۃ کی رقم سے ان کو تنخواہ نہیں دی جا سکتی۔

(۵) زکوٰۃ کا ایک مصرف مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دلجوئی کے لیے ان کو زکوٰۃ سے حصہ دیا جاتا تھا۔ ایک خیال یہ ہے کہ اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طرح کے لوگ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب اسلام کو قوت حاصل ہو گئی تو اس طرح کی تدبیروں کی ضرورت نہ رہی اور مصلحت ختم ہو گئی، اس لیے ایسے لوگوں کا حصہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کو بعض فقہاء نے اس مصرف کے منسوخ ہو جانے سے تعبیر کیا ہے، لیکن اکثریت کی رائے یہ ہے کہ مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ کا مصرف منسوخ نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اس کو ساقط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے لوگوں کا حصہ ساقط کیا گیا تھا، لیکن کسی زمانہ میں پھر ایسی ضرورت پیش آ جائے تو پھر دیا جا سکتا ہے۔

یہ خیال درست نہیں ہے کہ اس مصرف میں غیر مسلموں کو بھی دیا گیا تھا۔ امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ان سب لوگوں کے نام دیے ہیں جن کی دلجوئی کے لیے رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ سے حصہ دیا تھا۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے، ان میں کوئی کافر شامل نہیں تھا۔ مسلم اور ترمذی کی روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صفوان بن اُمیہ کو کافر ہونے کے زمانہ میں کچھ عطیات دیے تھے، لیکن یہ عطیات زکوٰۃ کے مال سے نہ تھے، بلکہ غزوۂ حنین کے مالِ غنیمت کا جو خمس بیت المال میں داخل ہوا تھا، اس میں سے دیے گئے تھے۔

(۶) ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت۔ لیکن کچھ لوگوں نے لفظ ''فی سبیل اللہ'' دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا

جو کسی حیثیت سے نیکی یا عبادت ہیں' جیسے مساجد' مدارس' شفا خانوں وغیرہ کی تعمیر' کنویں' پُل اور سڑکیں بنانا' رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ۔ یہ سراسر غلط اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔ اگر زکوٰۃ کے مصرف میں اتنا عموم ہوتا کہ تمام طاعات وعبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں آٹھ مصارف کا بیان بالکل فضول ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے ناواقف لوگوں کو جو عموم سمجھ میں آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے' بلکہ مراد وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بیان اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تصریحات سے ثابت ہے۔

(۷) جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے یہ شرط ہے کہ کسی مستحق کو مالِ زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دیا جائے۔ اس کے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اسی وجہ سے جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ مساجد' مدارس وغیرہ کی تعمیر پر یا ان کی دوسری ضروریات پر زکوٰۃ خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا' کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جائے تو اس حد تک زکوٰۃ کی رقم خرچ ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سے شفا خانوں میں جو دوا غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دی جائے' اس کی قیمت رقم زکوٰۃ میں محسوب ہو سکتی ہے۔ لیکن لاوارث میت کا کفن رقم زکوٰۃ سے نہیں لگایا جا سکتا' کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔

❁ ❁ ❁

بقیہ: مِلاكُ التأويل

اور اگر اس میں سے کچھ لوگوں کو سزا بھی ہوئی تو وہ عارضی ہوگی اور ایک دن منقطع ہو جائے گی۔ اور اس بنا پر یہاں لامِ تاکید کی قطعاً ضرورت نہ تھی' کیونکہ یہاں صرف سزا کا ذکر ہی مؤمن کا دل دہلا دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ سزا سے بچنے کا سامان مہیا کرنے کی فکر میں لگا رہے۔ جب کہ سورۃ الاعراف کی آیت سے قبل ایک پچھلی اُمت کی سیہ کاریوں کا تذکرہ ہے' جس کا اختتام اس آیت پر ہوتا ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۷)

''اور جب آپ کے ربّ نے اعلان کر دیا کہ وہ ان لوگوں پر قیامت کے روز تک ایسے ایسے لوگ مسلّط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب کا مزا چکھاتے رہیں گے۔''

اور پھر مذکورہ الفاظ لامِ تاکید کے ساتھ آئے ہیں:

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚ﴾

تو اگر ان کی بداعمالیوں' کفر اور عناد کو دیکھا جائے تو بالکل مناسب تھا کہ یہاں لامِ تاکید لایا جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ وہ اللہ کی گرفت سے بچ نہ پائیں گے۔ واللہ اعلم!

❁ ❁ ❁

برصغیر میں اسلامی نظریۂ حیات کی تشکیل اور اس پر سرسید و اقبال کے اثرات کا تقابل

محمد رشید ارشد [۱] — اویس شوکت [۲]

***Abstract**: In the 20th century, the Western episteme became dominant at a global level and the perspective that was developed by the West, owed to its recent century 's development in knowledge, regarding God, the human being, and universe and was on one hand the cause of an annihilation of the traditional /orthodox perspectives, and on the other hand a reason to create an ideological turmoil in the rest of the world. Consequently, not only did the West became an ideal in matters of advancement in science and technology, but the Western epistemological theory, rationalism and empiricism, became the sole measure of all realities, including religious dogmas. In colonial subjugation Sir Syed 's episteme appeared, on the one hand, in a scenario where there are is a skepticism of the Muslim mind about its own tradition and on other hand, there is an alarming ignorance about the destructiveness of western civilization and the hollowness of the modern knowledge structure. This is the context where comes Iqbal, who not only have a deep sense of the grandeur of his civilization but also a thorough understanding of the dangers of the modern intellectual enterprie. This article intends to explore the constituent facets of the Muslim worldview in the contemporary world and in this context presents a comparative analysis of the thoughts of Sir Syed Ahmad Khan and Muhammad Iqbal.*

***Key Words**:Worldview, Narrative, Muslims Civilization, Ideology, Episteme, Western Civilization.*

(۱) لیکچرر: شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ پی ایچ ڈی سکالر' کراچی یونیورسٹی' کراچی
ای میل: rarshadpk@gmail.com
(۲) پی ایچ ڈی سکالر' انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز' پنجاب یونیورسٹی' لاہور
ای میل: m.awaischeemal@gmail.com

تعارف

برصغیر میں مسلمانوں نے تقریباً ہزار سال حکومت کی۔ لیکن انیسویں صدی میں اس اقتدار کا انگریزوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ اس دوران نا صرف برصغیر بلکہ قریب قریب تمام اسلامی دنیا کسی نہ کسی مغربی قوت کے زیرِ تسلّط چلی گئی۔ اسلامی تہذیب، جس نے لگ بھگ ہزار سال تک دنیا کے بڑے حصے پر حکومت کی تھی اور دنیا کو کارِ جہاں بانی و جہاں بینی [1] کے حوالے سے بہت کچھ دیا تھا، اس غلبہ سے اس کے تار و پود بکھر کر رہ گئے۔ اسلامی تہذیب کے زوال میں اندرونی عوامل تو کارفرما تھے ہی لیکن مغرب میں آنے والے علمی انقلاب اور اس کے نتیجے میں ہونے والی سائنسی ترقی بھی اس کی وجہ بنی۔ مغرب کی یلغار ابتدا میں محض سیاسی تھی لہٰذا مسلمانوں کی طرف سے ردِّعمل بھی اسی میدان میں ہوا اور تحریک شہیدین کی طرز کی جدوجہد کم وبیش ہر ملک میں شروع ہوئی اور ہر جگہ دنیاوی حوالے سے ناکام بھی ثابت ہوئی۔ اس کے بعد مغربی استعمار جب اپنے پنجے گاڑ چکا تو اگلا حملہ پھر علمی و فکری تھا۔ برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب باقاعدہ برطانوی حکومت قائم ہوگئی تو پھر اسلامی نظریۂ حیات براہ راست جدید فکر کے زیر اثر آ گیا۔ اس دوران مسلمانوں میں موجود شکست خوردگی نے نا صرف ان کے عقائد بلکہ دنیا و کائنات کے حوالے سے ان کے تصورات کے حوالے سے ان کو تذبذب کا شکار کر دیا اور آسمانِ مغرب سے طلوع ہونے والے علم کا حصول نا صرف دنیاوی کامیابی کے لیے ناگزیر قرار پایا بلکہ اس سے بڑھ کر بہت سوں کے نزدیک ایک دینی ضرورت بھی قرار پایا۔ لیکن چونکہ اسلامی تہذیب کو اپنا سنہرا دور گزارے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، لہٰذا غلبہ کی خواہش اور اس حوالے سے احساسِ محرومی ابھی لاشعور میں کہیں موجود تھی۔ لیکن ساتھ ہی کمزوری اور مایوسی کی کیفیات بھی دامن گیر تھیں۔ لہٰذا یہ بنیادی سوال اس دور کے اصحابِ فکر کے سامنے تھا کہ استعمار سے تعامل کس حد تک اور کیونکر ہو۔ ایک دوراہا سامنے تھا کہ ماضی سے پیچھا چھڑا کر حال کو سنوار لیا جائے، جبکہ دوسرا رستہ ماضی کے ساتھ ربط اور استعمار سے مکمل بے اعتنائی برتنے کا تھا۔

اپنے یہاں اوّل الذکر فکر کے سرخیل سرسید احمد خان اور ان کے اصحاب تھے جبکہ دیوبند نے اپنے لیے اصحابِ کہف کی سنت پر عمل کرتے ہوئے دوسرے رستے کا انتخاب کیا۔ پہلی فکر کے زیر اثر علی گڑھ کالج اور اس جیسے ادارے قائم ہوئے جن کی وجہ سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے حصول کا عمومی غلغلہ ہوا اور مسلمانوں کا اچھا خاصہ حصہ دنیاوی طور پر پسماندگی کی اس کیفیت سے نکل آیا جس میں وہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد چلا گیا تھا۔ بعد میں اسی طبقہ نے مسلمانانِ برصغیر کی سیاسی و فکری راہنمائی کا بیڑا اٹھایا اور آزادی کے حصول کے لیے کامیاب جنگ لڑی۔ دوسری طرف ایک متوازی لہر دیوبند اور دیگر دینی مدارس کی تھی جو معاشرے کے عمومی دھارے سے الگ تھلگ قال اللہ اور قال الرسول میں مگن رہے۔ ان دو متوازی نظاموں کا فوری اثر تو یہ ہوا کہ اسلامی فکر میں دین و دنیا کی جدائی پیدا ہوگئی اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور مذہبی قیادت الگ الگ ہوگئی۔ ابتدا میں یہ محض لائحہ عمل کا اختلاف تھا جو مرورِ زمانہ سے بُعدالمشرقین میں بدل گیا۔ حتیٰ کے ایک دوسرے کے

حوالے سے تحقیر و توہین کے جذبات ذہنوں میں پیدا ہو گئے۔ نہ زندگی کے آئیڈیل ایک رہے اور نہ ہی نظریۂ حیات ایک رہا۔ اس تقسیم نے اسلامی سماج میں ایک مستقل خلیج پیدا کر دی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن اس کا زیادہ بڑا اور دیرپا اثر یہ ہوا کہ مسلمانانِ برصغیر کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ خدا' کائنات اور انسان کے حوالے سے مغربی تصورات' جو کہ سائنس کے زیر اثر پروان چڑھے تھے' کو برحق سمجھنے لگا اور مغربی تصورِ علم جس میں کلیدی اہمیت عقل اور حواسِ خمسہ کی تھی' ہی قبولِ حق کا واحد اور حتمی معیار قرار پائے۔ جو لوگ عقیدے اور وحی کی برتری کو دل سے ٹھیک سمجھتے تھے' دماغ ان کے بھی مغربی علوم کی حقانیت کے قائل ہو گئے۔ لہٰذا ترقی کا معیار' نظامِ تعلیم' سماجی اقدار' احساسات' ریاستی نظام' غرض ہر حوالے سے ایک آئیڈیل کی حیثیت مغرب کو حاصل ہو گئی۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر میں اس فکر کے فروغ میں سب سے بڑا حصہ سرسید احمد خان کا ہے اور بقول احمد جاوید ان کو برصغیر میں جدید مسلم تہذیب کے حوالے سے وہی مقام حاصل ہے جو قدیم یونان میں افلاطون کو حاصل تھا۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان کچھ اور لوگ بھی تھے جو جدید علوم سے واقف ہونے کے ساتھ اپنی تاریخ اور علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے مغرب کی اندھی تقلید کے بجائے اس سے استفادہ پر زور کے ساتھ ساتھ مغربی فکر و فلسفہ میں موجود خرابیوں کو پہچاننے پر بھی زور دیا اور جدت اور روایت کے امتزاج پر زور دیا۔ اس فکر کے حاملین میں علامہ شبلی' سید امیر علی' سید سلیمان ندوی' اکبر الٰہ آبادی وغیرہ نمایاں افراد تھے' لیکن سب سے زیادہ قبولِ عام جس کے حصے میں آیا اور اپنے یہاں تفہیم مغرب کے حوالے سے جس کا دور دور تک ان کے معاصرین میں کوئی ثانی نہ تھا وہ شخصیت علامہ محمد اقبال کی تھی۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اقبال کے ہاں جو روایت پر نقد ہے اس کو تو خوب قبولیت ملی البتہ جو حصہ مغرب پر نقد اور اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل میں روایت کے کردار سے متعلق تھا وہ عمومی پذیرائی سے محروم رہا۔ اس مقالے میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے نظریہ حیات کی تشکیل جب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز استعمار میں ہوئی تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا تھے۔ نیز اس حوالے سے فکر سرسید اور فکر اقبال کا تقابل کر کے یہ جائزہ لیا جائے گا کہ اپنے یہاں حقیقی قبولیت کس فکر کو حاصل ہوئی۔

جدید مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں اور نظریۂ حیات کا اسلامی نظریۂ حیات سے تقابل

تمام مذاہب کی طرح' اسلامی تعلیمات کا مرکز و محور بھی انسان ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات کا مرکز و محور انسان کی دونوں جہانوں میں بھلائی و کامیابی ہے۔ قرآن مجید سے حتمی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی واحد ذات ہی اس کائنات میں Absolute Reality ہے' انسان اسی کی پیدا کردہ مخلوق ہے اور یہ کائنات بھی اللہ کی تخلیق ہے اور اس کائنات کا انجام قیامت ہے جس کے بعد ایک نئی اور اصل زندگی شروع ہو گی۔ اور یہی

جوابات مل کر ایمان بناتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق چونکہ مابعد از طبیعاتی مسائل سے ہے لہٰذا انسان اپنی عقل و حواس کو استعمال کرتے ہوئے ان کے یقینی جوابات تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگرچہ یہ صلاحیتیں وحی میں بیان کیے گئے حقائق کو انسان کے اندر جاگزیں کرنے میں ممد و معاون ہیں۔ اسی طرح قرآن انسان کو کائنات کا مرکز اور اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق قرار دیتا ہے' جیسا کہ سورۃ التین میں فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝۴﴾

''اور ہم نے انسان کو بہترین نہج پر پیدا کیا۔''

اسلامی نقطہ نظر سے نہ تو یہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آ گئی اور نہ ہی انسان سمیت دیگر مخلوقات۔ یہ سارا عمل بامقصد اور اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے اذن سے ہو رہا ہے۔ انسان کا مقصد تخلیق قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذّٰریت)

''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔''

اس آیت مبارکہ میں لفظ ''عبادت'' کا مطلب اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اس کی محبت کے جذبے سے کرنا ہے۔ قرآن انسان کی تخلیق پر روشنی ڈالتا ہے کہ اللہ نے انسان کو گارے اور مٹی سے پیدا فرمایا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا[۲] تو اس طرح خاک و نور کے امتزاج سے انسان کی تخلیق ہوئی اور وہ اس قابل ہوا کہ اللہ نے اس کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ گویا انسان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے۔

انسان میں خاص اپنی روح میں سے پھونکنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم عطا کیا اور اس میں آگے سے آگے بڑھنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ اس کو شعور دیا' داخلی راہنمائی کے لیے ضمیر ودیعت کیا' عمل کی آزادی دی اور حسن و کمال کی جانب ترقی کرنے کا ذوق بھی عطا فرمایا۔ انسان کی یہی خصوصیات اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نامکمل اور ادھورا عکس بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی تہذیبیں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان محض ایک مادی جسم نہیں بلکہ انسان کی حقیقی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی وجود کا حامل ہے۔ یہ روایتی تصور انسان کو تمام تر مخلوقات سے اشرف اور کائنات کا مرکز قرار دیتا ہے' لیکن گذشتہ پانچ صدیوں میں علم میں بتدریج ترقی نے اس روایتی ''تصورِ انسان'' کا شیرازہ بکھیر دیا اور اسے ایک حیوان کی سطح تک گرا دیا۔

کسی بھی تہذیب کے تحت سماج میں تعلیم اور تربیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ تہذیب انسان کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ تاریخی حوالے سے انسانی فطرت کا مطالعہ ان اہم ترین سوالات میں سے ایک ہے جس کے ساتھ انسان کو پالا پڑا ہے۔ جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی اور اس نے باقاعدہ سوچنا سمجھنا اور غور و فکر سے اپنے گرد و پیش کی ایک مربوط توجیہہ پیش کرنے کی سعی کی تو اس کی متجسّس طبیعت نے اس کے سامنے مختلف سوال اٹھائے۔ جن بنیادی ترین سوالوں سے اس کو واسطہ پڑا اور ہر دور میں جن سوالوں کا جواب دینے کی کچھ نہ

کچھ کوشش کی گئی وہ انسان کی حقیقت اور اس کائنات سے اس کے ربط و تعلق سے متعلق تھے[۳]۔ یعنی کائنات کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اور حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ مذہبی روایت کا بجا طور پر یہ دعویٰ ہے کہ جب اولین انسان اس زمین پر آیا تو وہ الہامی ہدایت کی روشنی میں ان سوالات کے جواب جانتا تھا۔ چونکہ ان سوالات کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے تو صرف مابعد الطبیعاتی ماخذ ہی ان سوالات کے صحیح اور ٹھوس جواب فراہم کر سکتا تھا۔ البتہ انسانی تاریخ کا طائرانہ جائزہ یہ بتاتا ہے کہ انسان نے زیادہ تر زمانہ وحی سے بے خبری ہی میں گزارا۔ لہٰذا ان سوالوں کے حتمی جواب کے لیے قدیم انسان نے بھی ٹھوکریں کھائیں اور جدید انسان بھی ان کے جواب کی تلاش میں ان بھول بھلیوں میں پڑا کہ اس تلاشِ بسیار نے خود انسان کو اس کے شرف سے محروم کر دیا۔

پندرھویں سے اٹھارہویں صدی کے دوران علم کے مختلف شعبوں میں ترقی نے تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔ معلوم تاریخ کی حد تک انسان کا اتنے بڑے فکری انقلاب سے گزرنے کا کوئی اور واقعہ نہیں ملتا۔ گلیلیو اور نیوٹن وغیرہ کی دریافتوں کی بدولت سائنس اس قابل ہوگئی کہ کائنات کی حقیقت سے متعلق ایک نیا تناظر دے سکے۔ پہلے Copernicus[۴] اور بعد میں Galileo[۵] نے یہ ثابت کر دیا کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں (Geocentric) بلکہ سورج ہے (Heliocentric) تو اس کی براہِ راست زد مسیحی عقائد پر پڑی۔ اب ہوا یہ کہ عیسائیت نے توہمات پر مبنی جو ایک ڈھانچہ سا بنا رکھا تھا دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ سائنس نے ان کے نظریات کو غلط ثابت کر دیا جس کے نتیجے میں سائنس اور مذہب میں کشمکش شروع ہوگئی۔ چنانچہ سائنس کو شیطانی علم قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی اور سائنس دانوں پر ظلم و ستم شروع کر دیا گیا۔ لیکن سائنس کے پاس چونکہ اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے تجرباتی دلائل تھے لہٰذا اس لڑائی میں عیسائیت شکست سے دوچار ہوگئی۔ ڈیکارٹ نے تشکیک سے علم تک پہنچنے کا نظریہ دیا' نتیجتاً تمام رائج نظریات و تصورات حتیٰ کہ خدا کا وجود بھی مشکوک ہوگیا۔ لوتھر کی تحریک احیاء مذہب' جو اگرچہ پوپ کے تسلط کے خلاف بغاوت تھی' بعد کے وقتوں میں مذہب ہی کے خلاف بغاوت بن گئی۔ عقل اور اس کے بعد حسیت ہی واحد معیارِ حق بن گیا جس کی کسوٹی پر مذہب' اخلاقیات اور عقائد وغیرہ کو بھی پرکھا گیا اور انسان' کائنات اور حقیقت مطلقہ سے متعلق قدیمی نظریات کو بھی غلط ثابت کر دیا گیا۔ تخلیق کائنات اور انسان کی تخلیق اب محض ایک حادثہ قرار پائی جس کے پیچھے کوئی اصل مقصد کارفرما نہ ہو۔

رچرڈ ٹارنش لکھتا ہے کہ

> *"The scientific liberation from theological dogma and animistic superstition was thus accompanied by a new sense of human alienation from a world that no longer responded to human values, nor offered a redeeming context within which could be understood the larger issues of human existence.(6)"*

ڈارون نے سائنس کی طرف سے بنے ہوئے نظریۂ کائنات کی مزید توثیق کی اور اس کا نظریۂ ارتقاء' انسان کو اس کے ساتھ لگی رہی سہی عظمت سے بھی محروم کر گیا۔ اس کے "Survival of the Fittest" کے نظریے نے

زندگی کے مادی نظریے کو مزید تقویت بخشی اور انسان اب زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب جانور بن گیا جو اپنا وجود برقرار رکھ سکا۔ فرائڈ نے ڈارون کے نظریے کو نفسیاتی دائرے تک وسعت بخشی اور انسان کے لاشعور کے اس کی شخصیت پر فیصلہ کن حد تک اثر انداز ہونے کے حوالے سے مدلل شواہد پیش کیے۔ اس نے انسانی شخصیت کو لاشعور کا غلام کہا اور یہ لاشعور محض جنسی جذبہ کی تسکین کے گرد گھومتا ہے۔ فرائڈ کے نظریے نے چند سالوں میں دنیا بھر سے توجہ حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں انسان ایسا جانور قرار پایا جس کی زندگی کا واحد اور سب سے بڑا مقصد جنسی خواہش کی تسکین ہے۔ اور اگر یہ لامحدود خواہش تسکین سے محروم رہے تو انسانی شخصیت نامکمل رہتی ہے۔ ان نظریات کو اس قدر قبولِ عام حاصل ہوا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ فرائڈ کے بعد کی دنیا اس سے پہلے کی دنیا سے مختلف تھی۔ جیسے فرائڈ نے فرد میں لاشعور کو متعارف کروایا' مارکس نے سماجی لاشعور سے پردہ اٹھایا اور تمام تر انسانی کوششوں اور مشقتوں کو مادی ترقی کے لیے جدوجہد قرار دیا۔ اس نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ پوری تاریخ کے دوران انسان نے اپنے اعلیٰ وارفع مقاصد کو حاصل کرنے کی جو کوشش کی' چاہے وہ انفرادی تھی یا اجتماعی' وہ اس کے اقتصادی حالات کی مسخ شدہ جھلک تھی۔

وہ تمام تر فکری ترقی جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے' کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ انسان جو کبھی اشرف المخلوقات اور کائنات کا مرکز تھا اور اس کی اصل اس کا روحانی و اخلاقی وجود تھا' ایک ایسا حیوان قرار پایا جس کی زندگی کا مقصد محض اپنی جسمانی ضروریات کی تسکین ہے۔ اس کی تخلیق کا نہ تو کوئی مقصد ہے اور نہ ہی اعلیٰ و ارفع منزل۔ اسی طرح علم کی تعریف میں عقل محض اور حواسِ خمسہ ہی مستند قرار پائے اور مذہب اور مابعد الطبیعاتی حقائق بتدریج انسان سے غیر متعلق ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً اجتماعی معاملات میں سیکولرازم ایک بنیادی قدر قرار پائی اور انفرادی سطح پر آزادی مطلقہ کا وہ تصور فروغ پایا جس کے تحت انسان کو ہر طرح کی قدغنوں اور اخلاقی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دینے کو ہی شرفِ انسانیت گردانا گیا۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں جب Nietzsche نے یہ دعویٰ کیا کہ خدا مر چکا ہے تو اس کا یہ دعویٰ نہ صرف اپنے دور کے لیے بلکہ آنے والی صدیوں کے لیے بھی جو راہ انسان نے اپنے لیے متعین کی اس کا ایک بے باک اظہار تھا۔ اب انسان نے خود کو الوہیت کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں یہ کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔

وحی کے علاوہ روایتی طور پر دو اور ذرائع علم بھی تسلیم کیے گئے ہیں' ایک عقلیت (Rationalism) اور دوسرے حسیت (Empiricism)۔ ریشنلزم کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ علم کا اصل ماخذ عقلِ انسانی ہے جو انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی معلومات اور حسی مشاہدے سے علم حاصل کرتی ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونانی فلاسفہ جیسے سقراط' افلاطون اور جدید فلاسفہ جیسے ڈیکارٹ کے ہاں کارفرما رہا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس Empiricism کا نظریہ یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی سیکھتا ہے وہ اپنی حسیات (sense) سے ادراک کرتا ہے۔ اور یہ انسان کی پانچ حسیات (Five senses) کائنات کو جاننے کے لیے ضروری اور مددگار ہیں۔ موجودہ

مغرب صرف حواس خمسہ سے حاصل معلومات وحقائق کو ہی علم قرار دیتا ہے' جبکہ دیگر ذرائع بشمول وحی' حتیٰ کہ عقل بھی اب وہاں مستند ذریعہ علم نہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری کی بیان کردہ ''علم'' کی تعریف کے مطابق:

"Facts, information and skills acquired through experience or education, the theoretical or practical understanding of a subject [7]"

تو اس تعریف میں بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ اصل علم اب ان کے ہاں ''حسی مشاہدہ'' یا Empiricism ہے۔ مذکورہ بالا تحقیقات کی روشنی میں جو علمی فضا تخلیق ہوئی اس میں مذہب سے نفرت اس کی بنیادوں میں شامل ہے اور اس بات پر تقریباً اتفاق کر لیا گیا ہے کہ تمام مذاہب علم اور ترقی کے دشمن اور انسانی تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظریہ علم (Epistemology) مذہبی علم اور عقیدہ کو کچھ بھی علمی حیثیت دینے پر تیار نہیں۔ یوں علم بالوحی کا انکار کر دیا گیا اور صرف علم بالحواس ہی کو اصل علم کا درجہ حاصل ہو گیا۔

مغربی فکر و فلسفہ کے زیر اثر جو ورلڈ ویو تشکیل پایا اس نے مذہبی حقائق کی پوری عمارت کو مسمار کر دیا اور بنیادی دینی عقائد کی جگہ کچھ نئے نظریات نے لے لی۔ چنانچہ حقیقت مطلقہ خدا کے بجائے کائنات' حیاتِ اُخروی کی جگہ دنیاوی زندگی' علم وحی کی جگہ حسی ادراک وعقل نے لے لی اور انسان جو اشرف المخلوقات سمجھا جاتا تھا' اس درجے سے گر کر محض ایک ترقی یافتہ حیوان قرار پایا' جس کی زندگی کا واحد مقصد اپنی خواہشات کی تسکین یا زیادہ سے زیادہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ نیز سائنس کی حیثیت اس مہا بیانیے (Meta Narrative) کی ہو گئی جو تمام تصورات وعلوم کی حیثیت اور ان کی حقانیت وعدم حقانیت کا تعین کر سکے۔

سرسید کی فکر میں مغرب سے تعامل اور اس کے اثرات

اس ورلڈ ویو کا جب برصغیر کی اسلامی تہذیب سے تعامل ہو تو یہ لازمی امر تھا کہ اس کی اسلامی فکر کے ساتھ مغائرت کی وجہ سے اس کو یکسر رد کر دیا جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست اور اس کے بعد کی مسلسل توہین وتنقیص نے مسلمانانِ برصغیر کو اس اعتماد سے محروم کر دیا تھا جو خارجی نظریات میں چھپی گمراہیوں کو پہچان کر ان کا رد کر سکے۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک طبقے نے تو اس سیلاب کا سامنا کرنے کے بجائے قومی دھارے ہی سے خود کو الگ کر لیا اور قال اللہ وقال الرسول میں مگن ہو گئے۔ اس طرح وہ دین کے مجموعی ڈھانچے کی حفاظت میں تو کامیاب رہے لیکن سماجی وملی معاملات سے رفتہ رفتہ بالکل غیر متعلق ہو گئے۔ دوسرا طبقہ جو میدان میں موجود رہا اور جس نے مسلمانوں کے سماجی وملی مفادات کی حفاظت وراہنمائی کا بیڑا اٹھایا وہ تحریک علی گڑھ اور اس سے منسلک اصحاب تھے جن کی سرکردگی سرسید احمد خان جیسی سربرآوردہ شخصیت کے ہاتھ میں تھی۔

سرسید احمد خان جنگ آزادی سے قبل ہی اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے[۸] کہ مسلمانانِ برصغیر کی بقا کا محض ایک ہی راستہ ہے کہ جدید علوم کو حاصل کیا جائے اور ماضی سے تعلق یکسر ختم کر دیا جائے۔ جنگ آزادی میں ناکامی اور اس کے بعد مسلمانوں کے لیے جب اپنی بقا اور تشخص کو برقرار رکھنا بھی دشوار ہو گیا تو ان کی یہ رائے ایک مکمل فکر

میں ڈھل گئی۔ اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

''جو شخص اپنی قومی ہمدردی سے اور دُور اندیش عقل سے غور کرے گا کہ ہندوستان کی ترقی ..... کیا علمی' کیا اخلاقی ..... صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجے کی ترقی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں۔ تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں (یعنی بھلا دیں' مٹا دیں)۔ ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے۔ یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست مال ہوں۔ ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں۔ ہم اپنی قدر' اپنی عزت کی قدر خود کرنا سیکھیں' ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اسی کو اپنا محسن سمجھیں''۔ (۹)

اسی موضوع پر ایک اور جگہ انہوں نے یوں روشنی ڈالی:

''ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو علومِ مشرقی کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے''۔ (۱۰)

اپنی مقامی زبان تک بھول جانے کی دعوت دینے والی فکر یقینی طور پر اُسی کی ہو سکتی ہے جو اپنی تہذیب کے تمام گوشوں سے آخری حد تک مایوس ہو چکا ہو۔ بعد کی زندگی انہوں نے اپنے اس خواب کو متشکل کرنے میں گزار دی۔ اپنی اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے روایتی مذہبی فکر کا ایک جوابِ دعویٰ (Anti-Thesis) تیار کیا۔ لیکن اس جوابِ دعویٰ کی ساری بناء انہوں نے فکرِ مغرب سے مستعار لی۔ اگر اس کی بنیادیں انہوں نے ہماری اپنی تہذیب میں موجود اوضاع کو استعمال کرتے ہوئے اٹھائی ہوتیں تو اس کی نہ صرف یہ کہ ظاہری شکل مختلف ہوتی بلکہ وہ بحیثیت مجموعی قوم کے لیے زندگی کا پیغام لے کے آتا اور اس کے نتیجے میں یقینی طور پر ہماری تہذیبی موت نہ واقع ہوتی۔ اس حوالے سے ان کے ہاں احساسِ کمتری کس درجے کو پہنچا ہوا تھا اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی' ایک ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا۔ انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے' نہ کہ بطور ایک دشمن کے''۔ (۱۱)

یہاں نہایت واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مغربی استعمار کے حوالے سے سرسید احمد خان کی سوچ کیا تھی۔ یہ اسلوب ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ سرسید احمد خان جب برطانیہ تشریف لے گئے تو مقصد ان کا انتہائی اعلیٰ تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے حوالے سے ولیم مور کی لکھی گئی کتاب کا جواب دیا جائے۔ اس سفر کے اخراجات کے لیے انہوں نے اپنی جائیداد تک فروخت کرنے سے گریز نہیں کیا۔ لیکن اس سفر میں بھی وہ برطانوی تہذیب سے مزید متاثر ہو کر واپس لوٹے۔ حتیٰ کہ وہاں کی گھریلو ملازمائیں تک ان کو تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ نظر آئیں اور ہندوستان کے وہ لوگ جو مقامی تہذیب کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے تھے وہ بھی ان کے مقابلے میں جانور سے بھی بدتر نظر آئے۔ اس حوالے ان کا نقطہ نظر ان کے سفرنامہ ''مسافرانِ لندن'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا

ہے۔مندرجہ ذیل عبارت اس حوالے سے دیکھی جاسکتی ہے:

''میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک' امیر سے غریب تک' سوداگر سے اہل حرفہ تک' عالم فاضل سے لے کر جاہل تک' انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔''(۱۲)

مزید برآں فکر مغرب سے بھی جو کچھ انہوں نے لیا وہ محض سطح پر نظر آنے والے افکار و تعقلات (Discourses) تھے اور کسی طور بھی اس فکر کو مغربی فکر کا ایک مشرقی ایڈیشن نہیں کہا جاسکتا۔یعنی خود مغربی فکر میں جو گہرائی تھی اس کا بھی مطالعہ کیے بغیر محض سائنس ہی کو مغرب کی ترقی کی بنیاد قرار دیا اور اس کی دریافتوں اور چند نظریات کو حتمی حقائق سمجھتے ہوئے مذہبی عقائد کو بھی انہیں محدود پیمانوں پر پرکھنا شروع کر دیا۔جبکہ خود مغرب ان نظریات کے حوالے سے مسلسل ایک ارتقائی عمل سے اس وقت بھی گزر رہا تھا اور آج بھی اس حوالے سے اس قدر قطعیت بیشتر سنجیدہ حلقوں میں سائنس کے حوالے سے نہیں پائی جاتی۔چنانچہ انہوں نے خدا کا جو تصور قائم کیا وہ نہ تو کسی وحی کی روشنی میں وجود میں آیا تھا اور نہ ہی ہماری تہذیب کے ساتھ اس کی کچھ مناسبت تھی' بلکہ مغربی فکر کے بھی اس حصے سے مستعار لیا گیا تھا جو سائنس کی بنیاد پر خدا اور وحی کو لغویات قرار دے چکی تھی۔اسی وجہ سے سرسید احمد خان نے جب اسلامی عقائد کی توضیح و تشریح شروع کی تو ان کے سامنے معیارِ حق محض حسیات پر مبنی نظریہ علم اور سائنسی نظریات تھا' لہٰذا اسی پر انہوں نے مذہب کے دیے مابعد از طبیعاتی اور مافوق المادیاتی حقائق کو پرکھنا شروع کر دیا۔اب چونکہ اس محدود معیار پر ان کی تصدیق و توجیہہ ممکن نہ تھی لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان تمام حقائق کی یا تو عقلی توجیہہ کرتے یا پھر ان کا یکسر انکار ہی کر دیتے۔چنانچہ ان کا قائم کردہ تصورِ خدا آزاد اور قادرِ مطلق نہیں بلکہ قوانین فطرت کا محتاج کی حد تک پابند تھا۔معجزے جو قرآن نے بیان کئے ان سب کی انہوں نے سائنسی توجیہہ کی' فرشتوں کے وجود کا انکار کیا اور وحی کے روایتی تصور کو بھی غلط قرار دیا۔

یہ محض ان کے ذاتی افکار نہ تھے بلکہ ان کے رسالوں' مضامین و مقالہ جات اور تعلیمی اداروں کے ذریعے مسلسل برسوں ان کی ترویج ہوتی رہی۔کچھ ان افکار کے پیچھے موجود دردمندی اور قربانی کی وجہ سے اور کچھ خارج میں موجود سازگار فضا کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ قبول کیا اور ایک پوری نسل ایسی تیار ہوگئی جو ماضی کے حوالے سے احساسِ کمتری کا شکار اور اس سے اپنے ہر تعلق کو توڑنے پر آمادہ تھی۔وہ نسل اپنے آباء کو برملا خبطی سمجھتی تھی اور دنیاوی ترقی اس کے سامنے سب سے بڑا مقصد تھا۔انسان کیا ہے؟ اس کا مقصد حیات کیا ہے؟ دنیاوی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے حوالے سے روایتی تصورات اور بیانیے اس طبقہ سے رخصت ہوگئے اور ان کی جگہ مغربی تصور حیات (World View) نے لے لی۔دیگر عوامل بھی بلاشبہ اپنی جگہ موجود تھے لیکن سب سے بڑی وجہ یہی تھی جس کی وجہ سے ہم سیاسی کے ساتھ ساتھ نظریاتی طور پر بھی مفتوح قوم بن گئے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ کسی قوم نے مسلمانوں کو فتح کیا اور ساتھ ہی نظریاتی سطح پر بھی فتح کر لیا۔ ورنہ تاتاریوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست اٹھانے کے باوجود مسلمانوں نے ان کے سامنے فکری اور اخلاقی میدانوں میں سپر اندازی نہیں کی اور زمانے نے یہ حیرت انگیز منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ جو قوم مسلمانوں کو ہتھیاروں کے میدان میں شکست و ریخت سے دوچار کر چکی تھی بہت جلد اسلامی ثقافت، تمدن اور پیغام کے سامنے سربسجود ہو گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بہت کم ایسا ہوا کہ فاتح قوم نے مفتوح کا دین قبول کر لیا ہو۔ بعد میں ترکانِ عثمانی اور ترکانِ تیموری مدت تک برسر اقتدار بھی رہے۔ شاعر مشرق نے اس حیران کن تاریخی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے: (۱۳)

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

سرسید اور ان کے رفقاء نے اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حوالے سے ان کی ملی زندگی میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور بلاشبہ ان کو قومی سطح پر اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے حوالے سے اہم ترین کردار ادا کیا، اس حوالے سے ان کی خدمات کا یقیناً ہم سب پر احسان ہے، لیکن ان کے اس احسان کو تسلیم کرتے ہوئے ایک سنجیدہ غور و فکر اس حوالے سے بھی ہونا چاہیے کہ احساسِ کمتری کی فضا میں بنی اس فکر کے مسلم سماج پر کیا منفی اثرات مرتب ہوئے۔ شیخ محمد اکرام اپنے اہم تحقیقی کام ''موجِ کوثر'' میں اس حوالے سے تفصیل سے کلام کرتے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں:

> ''سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی مادیت اور شیئیت پسندی پیدا ہو گئی۔'' (۱۴)

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''وہ مطمحِ نظر کی پستی اور کیریکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں یا اپنے بانیوں کے خیالات اور ان کی عظمت کا کوئی اندازہ کیے بغیر جو باتیں ان کے مخالف کہہ رہے تھے انہی کو زیادہ آب و تاب اور رنگ و روغن دے سکیں۔'' (۱۵)

یعنی جدید تعلیم تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر خوب پھیلی اور مسلمانوں کی عمومی حالت کو بہتر کرنے اور ان کو شکست و ریخت سے بچانے کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں، لیکن یہ اپنے زیر اثر لوگوں میں زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی لگن اور اس کے لیے قربانی کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام رہی۔ سرسید احمد خان سے یہ فکر پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلا۔ چنانچہ اس سے ایک طرف تو مغربی علوم کی تحصیل کی ایک زوردار تحریک پیدا ہوئی تو دوسری طرف اس کے متاثرین کی زندگیوں کا آئیڈیل مغرب بنتا گیا۔ اکبر الٰہ آبادی (۱۶) نے غالباً اسی کیفیت کو یوں بیان کیا کہ:

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

اسی فکر اور طرزِ زندگی کے حاملین قوم کی ملی زندگی میں راہنمائی کے منصب پر فائز ہوئے اور یوں اکثر و بیشتر مسلمانوں کا اندازِ فکر انہی سانچوں میں ڈھل گیا۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان میں روایتی مذہبی نظریہ حیات اور طرزِ فکر کی باقاعدہ موت واقع ہوگئی اور ادھر بھی خدا' آخرت' روح اور حیاتِ اُخروی کی جگہ دنیاوی ترقی اور مادہ پرستی جیسے تصورات نے لے لی۔ اور ترقی کا تصور' انسان کی حقیقت' اخروی زندگی وغیرہ کے حوالے سے روایتی تصورات نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور مغربی فکر کے تحت مادی ترقی اور دُنیاوی عروج ہی اصل مقصد حیات بن گیا۔ اس فکر کا اس قدر غلغلہ ہوا کہ اس کے خلاف زندگی گزارنے کو نہ صرف دنیاوی حوالے سے فرسودگی کی علامت سمجھا جاتا بلکہ دینی طور پر بھی غلط ٹھہرایا گیا۔ لہٰذا یہ بات بالکل درست طور پر کہی گئی ہے کہ اس جدید اسلامی نظریہ حیات کے برصغیر میں بانی سرسید احمد خان ہیں۔

اقبال کا تصورِ مغرب اور اس کے اثرات

بیسویں صدی کے برصغیر میں سرسید احمد خان کے بعد اہم ترین شخصیت علامہ محمد اقبال کی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی مذہبی فکر پر اور بھی بہت سے مفکّرین اثر انداز ہوئے اور اس کے فکری ارتقاء میں اپنا حصہ ڈالا لیکن اقبال کا اپنا ایک بلند مقام ہے۔ اثر پذیری اور قبولِ عام میں شاید ہی کوئی دوسرا اقبال کی ہمسری کر سکے۔ اقبال نہ صرف بحیثیت قومی شاعر بلکہ ایک آفاقی مفکّر کے ہمارے اجتماعی لاشعور اور دینی نظام احساس کا ناگزیر حصہ ہیں' اگرچہ عملی میدان میں اقبال سے کما حقہٗ استفادہ تو نہیں کیا جا سکا' نہ تو ان کی شاعری ہمارے سماجی و علمی رویوں اور معیارات کی بنا تعمیر کر سکی اور نہ ہی ان کی نثر میں جس ضرورت کو پہچان کر ایک کوشش کا آغاز کیا گیا تھا اس کی طرف خاص پیش قدمی ہو سکی۔ اقبال نے جس دور میں اپنے فکری سفر کا آغاز کیا تب مسلمانانِ برصغیر کو استعمار کے باقاعدہ زیر تسلّط آئے قریباً نصف صدی گزر چکی تھی۔ اس دوران جو نسل پروان چڑھ کر قومی سطح پر اپنا کردار ادا کر رہی تھی وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ فکری راہنمائی علی گڑھ ہی سے حاصل کرتی تھی۔ مغرب کے حوالے سے ان کے تصورات احساسِ کمتری میں گندھے ہوئے اور اس حوالے سے ان کا طرزِ عمل معذرت خواہانہ تھا۔ خارجی فضا بھی مسلمانوں کو اسی طرزِ عمل کے اختیار کرنے کا درس دیتی تھی اور داخلی طور پر بھی مسلمانانِ برصغیر کے سامنے کوئی ایسی فکر یا ایسی زوردار شخصیت موجود نہ تھی جو ان کو اس فکری پراگندگی سے بچا سکتی جو مغرب کی اندھی تقلید سے پیدا ہو چکی تھی۔ اسلام کو ترک کرنا بھی مشکل تھا اور مغربی رنگ میں رنگا جانا ترقی کے لیے ضروری۔ لہٰذا منطقی نتیجہ اس کا یہی نکلا کہ مذہب اپنے یہاں ایک بڑے طبقے کی زندگیوں سے غیر متعلق ہوتا چلا گیا۔

اس پس منظر میں اقبال مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایسے راہنما کے طور پر سامنے آتے ہیں جو مغرب کو سمجھتا ہے' ان کے افکار کے حسن و قبح میں فرق کر سکتا ہے' ماضی سے ان کا تعلق بھی جوڑتا ہے' انہیں دین سے اٹوٹ وابستگی پر بھی آمادہ کرتا ہے اور اس حوالے سے کسی احساسِ کمتری کا نہ خود شکار ہوتا ہے نہ ہی اپنے مخاطبین کو ہونے دیتا ہے۔ اہلِ اسلام کو انہوں نے اس عہد کے مطالبات کی طرف' وقت سے پہلے متوجہ کیا۔ انہوں نے اپنے دور

کے علمی معیارات کو سامنے رکھا اور اس تشکیلِ نو کے ہدف کو واضح کیا۔ ساتھ ہی یہ ابہام بھی نہیں رہنے دیا کہ وہ کوئی حرفِ آخر کہہ رہے ہیں۔ ان کا اصرار کسی خاص نتیجہ فکر پر نہیں تھا' غور وفکر کے استمرار پر تھا۔ اپنی شاعری میں انہوں نے اُمت کی تشکیلِ نو اور پیکر خاکی میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی اور زندگی کا پیغام دیا۔

عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ اقبال چونکہ جدید تعلیم یافتہ تھے لہٰذا فکر سر سید احمد خان ہی کا تسلسل تھے۔ لیکن بنظرِ غائر ان کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو تصویر کچھ مختلف بنتی ہے۔ وہ مغربی علوم کی اہمیت سے خوب آگاہ ہیں اور اس کی اہمیت پر زور بھی دیتے ہیں۔ نیز وہ سائنسی نظریہ علم پر دینی حقائق کو پیش کرنے کے حوالے سے جدید علمِ کلام کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ ان کے خطبات Reconstruction of Religious Thoughts in Islam اصل میں اسی سلسلے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔ خود اقبال نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان خطبات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ:

> *"I propose to undertake a philosophical discussion of some of the basic ideas of Islam, in the hope that this may, at least, be helpful towards a proper understanding of the meaning of Islam as a message to humanity."*(17)

خصوصی طور پر پہلے اور آخری خطبے میں مذہبی مشاہدے کو بھی مستند ذریعہ علم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ آخری خطبہ Is religion possible? میں سوال اٹھایا ہے کہ ان حالات میں کیا مذہب کا کوئی امکان ہے؟ یعنی اس تصورِ علم کے مطابق مذہب کی کیا حیثیت رہ گئی ہے جو کہ محض حسی مشاہدے تک محدود ہو گیا ہے؟ کیا اس میں مذہب کی بھی کوئی صورت باقی بچتی ہے یا کہ نہیں؟ خطبات میں اقبال نے دینی مسلمات کو مروّجہ عقلی معیارات کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ ان کے خیال میں اب عقل جدید پرانے طرز استدلال کو تسلیم نہیں کر سکتی' لہٰذا اگر جدید معیار کے مطابق دین کو ثابت نہ کیا جا سکا تو دنیا میں دین کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اقبال کی اس کوشش کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل عمر مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''اقبال نے تشکیل جدید میں جس نئی الٰہیات کی بنیاد رکھی ہے اس کے پیچھے اقبال کے دو بنیادی تصورات کام کر رہے ہیں: (۱) اقبال یہ جانتے ہیں کہ نیا انسان ''محسوس'' کا خوگر انسان ہے جسے ''اس قسم کے فکر کی عادت ہو گئی ہے جس کا تعلق اشیاء اور حوادث کی دنیا سے ہے''۔ جس سے اقبال یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس انسان سے تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک ایسے منہاج کی ضرورت ہے جو نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے تا کہ وہ آسانی سے اسے قبول کر لے۔ اقبال کے نزدیک یہ کام اس قسم کے لوگ بالکل نہیں کر سکتے جو عصر حاضر کے ذہن سے بالکل بے خبر ہیں' اور اس لیے موجودہ دنیا کے افکار اور تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ (۲) پرانا طریق کار اس لیے بیکار ہے کہ الٰہیات کے وہ تصورات جن کو اب ایک ایسی مابعد الطبیعیات کے الفاظ و اصطلاحات میں پیش کیا جاتا ہے جو مدت ہوئی عملاً مردہ ہو چکی ہے ان لوگوں کی نظر میں بیکار ہیں جن کا ذہنی پس منظر یکسر مختلف ہے۔ چنانچہ ان دونوں حقیقتوں

کے پیش نظر اقبال کہتے ہیں ''ہم مسلمانوں کو ایک یہ بڑا کام درپیش ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سرِ نو غور کریں''۔ اب چونکہ عصرِ حاضر کے انسان سے وہ انسان مراد ہے جو مغربی تہذیب سے پیدا ہوا ہے اس لیے اقبال کی نئی الٰہیات کی تشکیل کی کوشش کا حقیقی مقصد مغربی اور اسلامی تہذیب کے درمیان مشترکہ عناصر کی جستجو ہے اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تہذیب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ''محسوس کے خوگر'' انسان کے ذہن کے مطابق نہ ہو۔''(۱۸)

مغربی علمی معیارات کے مطابق جدید علمِ کلام کی تشکیل کی ضرورت کی حد تک اقبال سرسید احمد خان کے ہم رکاب ہی نظر آتے ہیں اور ان پہلوؤں سے وہ بلا شبہ فکرِ سرسید ہی کا تسلسل قرار دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت سے پہلو ان (اقبال) کی فکر میں البتہ ایسے ہیں جن میں وہ سرسید کے بالکل مختلف بلکہ متضاد نقطہ نظر کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے ان کے افکار سے محض چند نمونے سطور زیریں میں پیش کیے جائیں گے۔

اقبال مسلمانوں کے زوال کے حوالے سے سرسید کے بنیادی تجزیہ ہی سے اتفاق نہیں کرتے:(۱۹)

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے!
زوال بندۂ مؤمن کا بے زری سے نہیں

اقبال کا مغرب کا مطالعہ سطحی نہیں تھا' اسی وجہ سے وہ مغربی علوم کو انسانیت کے لیے ہلاکت آفریں سمجھتے تھے۔ ان کا اس حوالے سے اپنا دعویٰ بالکل صداقت پر مبنی ہے کہ:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل (۲۰)

ایک اور جگہ اس تہذیب کا کھوکھلا پن اور علوم کے انسانیت کو نفع پہنچانے کی صلاحیت سے عاری ہونے پر یوں طنز کیا:

یہی آدم ہے سُلطاں بحر و بَر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں' نے خدا بیں' نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا! (۲۱)

یعنی جدید انسان کا جو نظریہ حیات ہے وہ نہ تو خود انسان کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے نہ ہی خدا تک لے کے جاتا ہے اور نہ ہی کائنات سے متعلق اس کو کوئی حتمی تصور دیتا ہے۔ سائنس کے حوالے سے اُس دور میں بھی اور آج بھی مسلمان احساسِ کمتری کا شکار ہیں اور ایک بڑا طبقہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی سے نکلنے کا واحد حل ہی سائنس میں ترقی کو قرار دیتا ہے' جبکہ خود مغرب میں بہت سے سنجیدہ اصحابِ دانش یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں کہ سائنس نے انسان کو کس طرح روحانیت اور اخلاقیات سے دور کر دیا ہے اور کس طرح اس کی وجہ سے معاشروں میں بہت سے انسانی المیوں نے جنم لیا ہے۔ اس حوالے سے اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار تو بالکل الہامی محسوس ہوتے ہیں کہ اس اسلوب اور اس کاٹ کے ساتھ سائنس پر نقد آج بھی مشکل ہے تو اُس دور میں تو یہ اور بھی مشکل

کام تھا۔

'عشق ناپید و خرد میگزدش صُورتِ مار'
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے اَفکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا! (۲۲)

جدید مغربی تہذیب کا ایک اہم ستون سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے بطن سے پھوٹی ہوئی افادیت پسندی اور مادہ پرستی ہے۔ یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر لوگوں کی زندگی کا مطمحِ نظر محض ملازمت کا حصول بن کے رہ گیا اور زندگی میں آگے سے آگے بڑھنا ہی مقصدِ حیات قرار پایا۔ یقیناً یہ طرزِ عمل اُس وقت مسلمانوں کی بقا کے لیے ضروری تھا' لیکن اس کا ہماری زندگیوں کا مستقل حصہ بن جانا ایک زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کے ہاں اس حقیقت کا اظہار ہمیں یوں ملتا ہے:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا' جس نے
قبض کی رُوح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے' کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ! (۲۳)

مذکورہ بالا اشعار میں جہاں مغربی مادہ پرستی کو موت قرار دیا گیا ہے وہیں جدید نظام تعلیم پر بھی گرفت کی گئی ہے جو انسان کو اس کی تخلیق کے اصل مقصد سے بیگانہ کر دے۔ اقبال نے اور بھی بہت سے مقامات پر علم جدید کے انسانیت کے لیے ہلاکت آفریں ہونے کو بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''پیر و مرید'' کا مندرجہ ذیل حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ (۲۴)

مریدِ ہندی

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں!

پیرِ رُومی

علم رَا بَر تن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود

مریدِ ہندی

اے امامِ عاشقانِ دردمند!　　یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند
'خشک مغز و خشک تار و خشک پوست　　از کجا می آید ایں آوازِ دوست!'
دورِ حاضر مست چنگ و بے سرور　　بے ثبات و بے یقین و بے حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا　　دوست کیا ہے، دوست کی آواز کیا
آہ، یورپ با فروغ و تاب ناک　　نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

پیرِ رومی

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست　　طُعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

مریدِ ہندی

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب　　روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیرِ رومی

دستِ ہر نا اہل بیمارت کند　　سوئے مادر آ کہ تیمارت کند!

ان اشعار میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اقبال کا درس تو ''سوئے مادر'' آنے کا ہے نہ کہ مغرب کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اس کی اندھی تقلید میں بھاگتے چلے جانا(۲۵)۔ اپنی شاعری میں تہذیبِ مغرب پر نقد کے ساتھ ساتھ اقبال اس کی موت کی بھی پیش گوئی کرتے ہیں(۲۶)۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا!

مغربی تہذیب، مادہ پرستی، آزادیٔ نسواں، انسان کا معاشی حیوان بن جانا ایسے موضوعات پر نقدِ اقبال کے پورے کلام میں جابجا ملتی ہے۔ سطورِ بالا میں اردو شاعری کے حوالے دیے گئے لیکن ان کا فارسی کلام بھی اس حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ اس حوالے سے ''اسرار و رموز''، ''پس چہ باید کرد'' اور ''جاوید نامہ'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مغربی تہذیب پر نقد اور اس کے زوال کی پیش گوئی کے ساتھ ساتھ اقبال اُمّتِ مُسلمہ کے دوبارہ عروج کا بھی ذکر جابجا کرتے ہیں(۲۷)۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:(۲۸)

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

غرض اقبال مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے تعامل کا ایک پورا لائحہ عمل دیتے ہیں اور ان کو فکری پسماندگی سے نکل کر دنیا میں مردانہ وار زندگی گزار کر ملّتِ اسلامیہ کو دوبارہ عروج دلانے کا سبق بھی دیتے ہیں۔ نیز ان کے ہاں امید کا درس ملتا ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی کا مؤثر علاج بن سکتا ہے۔ ان کے چند تفردات کو چھوڑ کر بلاشبہ ان کی فکر میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو دورِ حاضر میں اسلامی نظریۂ حیات کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں اور جب بھی اس حوالے سے سنجیدگی سے کام کیا گیا تو ان کی فکر سے استفادہ ایک لازمی امر ہوگا۔ خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ان کے کام کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

حاصل کلام

سرسید اور اقبال دونوں کے برصغیر کے مسلمانوں پر لاتعداد احسانات ہیں۔ دونوں نے خلوصِ نیت سے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کے لیے ایک لائحہ عمل تجویز کیا اور پھر اس کے حصول کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دیں۔ ان کے کسی نتیجے سے اختلاف البتہ کیا بھی جا سکتا ہے اور بعض صورتوں میں ناگزیر بھی ہے۔ قوموں کی اجتماعی ترقی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے ماضی کا کسی قدر درست تجزیہ کرتے ہوئے اپنے لیے مستقبل کا راستہ اخذ کر سکیں۔ جہاں تک اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل کا تعلق ہے تو صفحاتِ گذشتہ میں کی گئی بحث سے یہ بات عیاں ہے کہ سرسید احمد خان کے تصورات ان کے دور میں ہمارے لیے کتنے ہی ضروری کیوں نہ ہوں، وہ دورِ حاضر میں اسلامی نظریۂ حیات کی تشکیل کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ نہ تو وہ ہماری تہذیب کے تمام تصورات کا احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی مغرب خود ان کے حوالے سے حتمی رائے قائم کیے ہوئے ہے۔ وہ سائنس جس پر تکیہ کرتے ہوئے سرسید نے عقائد تک کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے وہ سائنس خود نئی منزلوں کے سراغ میں پچھلے نظریات سے رجوع کر چکی۔ لہٰذا یہ لازمی امر تھا کہ سرسید کے نتائج فکر بھی اپنی اطلاقیت (validity) اور relevance کھو دیتے۔ اس حوالے سے سلیم احمد نے اپنے ایک مضمون میں بھرپور تبصرہ کیا ہے جو اس پوری صورتحال کا کامل احاطہ کرتا ہے۔

''سرسید بہت بڑے بوتے کا آدمی تھا اور سرسید نے جو کر دیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ اکبر بھی ساری زندگی مخالفت کرنے کے باوجود مان گئے کہ سید کام کرتا تھا۔ کام کے طریقے' ذرائع اور حدود پر مجھے اعتراض ہے' کام کے مقصد اور نیت پر نہیں۔ وہ مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے' اسلام کے حقیقی مصدق تھے۔ البتہ ان کے عمل نے ان کی نیت اور مقصد سے آزاد ہو کر ایسے نتائج پیدا کیے جن سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجھے اختلاف ہے بھی' مگر یہ اختلاف بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ ایک وقت تھا جب ہمیں ایسے نتائج کی ضرورت تھی۔ ہم نے ان نتائج سے کام لیا اور زندہ رہے۔ زندہ رہے اور جہاد کیا۔ جہاد کیا اور انگریزوں کو نکال بھگایا۔ روحِ ہندوستان اس جنگ میں ہمیشہ سرسید کے پیدا کیے ہوئے سپاہیوں کی ممنونِ منت رہے گی۔ میرا اختلاف یہ نہیں ہے کہ وہ نتائج ایک وقت میں کیوں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدا ہونا تاریخی تقاضا تھا۔ اختلاف یہ ہے کہ وہ نتائج اب بھی کیوں برقرار ہیں۔ اب ہم زندگی کی نئی منزلوں میں ہیں۔ ہمیں اب ایک دوسرے طریقہ کار اور حکمت کی ضرورت ہے۔ ہم اب بالکل دوسرے نتائج پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ چنانچہ سرسید جو کبھی ہمارے لیے سنگ میل تھے' اب سنگِ راہ ہیں۔ اب وہ راستہ نہیں دکھاتے' گمراہ کرتے ہیں۔ منزل رسی میں مدد نہیں دیتے' رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ تاریخ کا تقاضا ہے کہ اس سنگ راہ کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس کی اپنی وقتی اور تاریخی اہمیت اور ضرورت کا اعتراف کر کے اس کو ٹھوکر مار دی جائے اور آگے بڑھا جائے۔ سرسید زندہ ہوتے تو مجھے حق الیقین ہے کہ جو لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں ان کی تائید کرتے۔ شاید ان میں سے پھر کوئی مسدس مدوجزرِ اسلام قسم کی کوئی چیز لکھ ڈالتا اور سرسید اسے بھی اپنا وسیلہ نجات بنا لیتے۔''(۲۹)

یہ ایک المیہ ہے کہ آج بھی مغرب کے حوالے سے سرسید کے اخذ کردہ نتائج فکر موجود ہیں اور اپنے یہاں اس رویے کا دور دور تک کوئی اظہار نہیں ملتا جس کی تلقین اقبال نے کی۔ بلکہ وہ لوگ جو سرسید سے بغض کی حد تک اختلاف کرتے ہیں وہ بھی زندگی کے انہی تصورات کو ذہناً اور عملاً قبول کر چکے جن کی طرف راہنمائی سرسید مرحوم نے کی تھی۔ انسانی زندگی کی حقیقت اور اس میں تصورِ آخرت کی مرکزی حیثیت' ترقی کا تصور' زندگی کے مقاصد' غرض ہر چیز مغربی تہذیب کی چکاچوند سے متاثر ہے اور مذہبی طبقات سمیت سماج آج بھی مغرب کے ظاہری روشن چہرے کے اندر چھپی ہوئی تاریکی کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ اگرچہ اقبال کو قومی شاعر کا درجہ دے کر اور اس کا بت بنا کر پوجنے والے اب بھی وافر تعداد میں موجود ہیں اور کبھی بھی اس حوالے سے ہم تہی دامن نہیں رہے' لیکن اقبال کی فکر کے وہ عناصر جو ہمیں مغرب سے تعامل کا لائحہ عمل دیتے ہیں' جن کی روشنی میں سماج کی تعمیر کی جا سکتی ہے' نظامِ تعلیم مرتب کیا جا سکتا ہے' نظامِ اخلاق کی تدوین نو ہو سکتی ہے' خدا' انسان اور کائنات سے متعلق مذہبی تصورات کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بیان کیا جا سکتا ہے' آج تک ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا جا سکا۔ یعنی عملاً اس حوالے سے کیا مذہبی اور کیا سیکولر سب کے سب مغرب کے سامنے سجدہ ریز ہی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس بیان کو مبالغہ سمجھا جائے' لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد سائنس کی تعلیم ہی ہے اور سماجی علوم میں دیا جانے والا تناظر اور تصورِ انسان عین وہی ہے جو ہمیں جدید مغربی علوم عطا کرتے ہیں۔

حواشی

(۱) ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۸۶ء)

(۲) ﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾ (الحجر)

(۳) اسی کو ورلڈ ویو کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ بنیادی سوال آتے رہے ہیں:

- حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ What is Absolute Reality?
- انسان کیا ہے؟ What is Man?
- کائنات کیا ہے؟ What is Universe?
- علم کیا ہے؟ What is Knowledge?

(4) Mathematically proved that the Universe is Heliocentric (Nicolaus Copernicus, 1473-1543).

(5) Invented Telescope (Galileo Galilei,1564-1642).

(6) Richard Tams, The Passion of Western Mind (London:Random House,1991),112.

(7) Oxford Advanced Learner, 9th Edition

(۸) ''ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے سایہ عاطفت میں ہم امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ میری رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس سے اسی رائے پر قائم ہوں''۔ ضیاء الدین لاہوری، افکارِ سرسید۔ (لاہور: ۲۰۰۶ء)، ص ۲۴۲۔

(۹) ضیاء الدین لاہوری، افکارِ سرسید، ص ۲۰۷، مقالاتِ سرسید، ج ۵، ص ۶۶

(۱۰) ایضاً، ص ۲۰۷ (۱۱) ایضاً، ص ۲۳۸

(۱۲) سرسید احمد خان، مسافران لندن (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء) ص ۱۷۰

(۱۳) محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (لاہور: ۲۰۰۱ء) ص ۲۲۰

(۱۴) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ) ص ۱۴۷

(۱۵) ایضاً، ص ۱۴۸

(۱۶) اکبر الہ آبادی نے طنزیہ شاعری کے ذریعے تہذیب وفلسفہ مغرب کے خلاف بند باندھنے کی کتنی زبردست کوشش کی۔ ان کے اس کام کی اہمیت شاعر مشرق پر خوب روشن تھی، اسی لیے علامہ اقبالؒ اپنے خطوط میں حضرت اکبرؒ کو اپنا پیر قرار دیتے، ان کا شرفِ نیاز حاصل کرنا چاہتے اور اپنا دل حضرت اکبرؒ کے سامنے چیر کر رکھنا چاہتے تھے۔ اقبال خود کو لاہور میں تنہا سمجھتے اور حضرت اکبرؒ کو وہ فرد واحد جانتے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔ وہ اکبر سے طویل خط لکھنے کی استدعا کرتے اور اس خواہش کو روحانی خود غرضی قرار دیتے۔ وہ حضرت اکبرؒ کو پیر مشرق قرار دیتے تھے۔ حضرت اکبر کے بارے میں اقبال نے یہاں تک لکھا کہ ''اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا قطعاً رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ خط وکتابت سے پہلے آپ سے جو ارادت و عقیدت تھی ویسی اب بھی ہے اور ان شاء اللہ جب تک زندہ رہوں ایسی ہی رہے گی''۔ اقبال نے چند اشعار حضرت

اکبر کے رنگ میں بھی لکھے مگر عوام کی بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ لیا۔ اقبال کے خیال میں حضرت اکبر نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ (شعر) میں بند کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ اقبال ہیگل کو بہ اعتبار تخیل افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے تھے۔ حضرت اکبر کے خطوط سے اقبال پر غور و فکر کی راہیں کھلتیں اس لیے اکبر کے خطوط وہ محفوظ رکھتے۔ حضرت اکبر کے اشعار پڑھ کر اقبال کو شیکسپیئر اور مولانا روم یاد آ جاتے تھے۔ اقبال ''شکوہ' جواب شکوہ'' پر دس پندرہ سطور کا دیباچہ ناشر کے مطالبے پر حضرت اکبر سے لکھوانے کے خواہش مند تھے۔ (اقبال نامہ' ص۳۷۲' ۳۷۴' ۳۷۶' ۳۷۷' ۳۷۸' ۳۹۳' ۳۹۷' یک جلدی تصحیح و ترمیم شدہ' اقبال اکادمی پاکستان' ۲۰۰۵ء)

(17) M.Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, (I.A.P, Lahore,1989) edited and annotated by Shaikh Muhammad Saeed

(۱۸) سہیل عمر' خطبات اقبال نئے تناظر میں (لاہور: اقبال اکیڈمی) ص۳

(۱۹) محمد اقبال' کلیاتِ اقبال (لاہور: اقبال اکیڈمی) ص۵۳۲

(۲۰) ایضاً' ص۳۹۱ (۲۱) ایضاً' ص۴۱۳ (۲۲) ایضاً' ص۵۸۳

(۲۳) ایضاً' ص۵۹۶ (۲۴) ایضاً' ص۴۶۲

(۲۵) نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!
(ایضاً' ص۳۲۵)

(۲۶) ایضاً' ص۱۶۷ (۲۷) ایضاً' ص۲۲۲ (۲۸) ایضاً' ص۲۹۸

(۲۹) سلیم احمد' مضامین سلیم احمد' (کراچی: اکادمی بازیافت' ۲۰۰۹ء) ص۲۹۰

کتابیات

☆ احمد' منظور' اقبال شناسی' ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور' ۲۰۰۲ء۔

☆ احمد' سلیم' مضامین سلیم احمد۔ کراچی: اکادمی بازیافت' کراچی' ۲۰۰۹ء۔

☆ اکرام' شیخ محمد' موجِ کوثر' ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ' لاہور' ۲۰۰۷ء۔

☆ اقبال' محمد' اسرار و رموز' اقبال اکیڈمی' لاہور' ۱۹۴۰ء

☆ اقبال' محمد' کلیات اقبال' اقبال اکیڈمی' لاہور

☆ اقبال' محمد' The Reconstruction of Religious Thought in Islam' لاہور' ۱۹۶۸ء۔

☆ انصاری' اسلم' تاریخ' نظریہ' مشمولہ: دائرہ معارف اقبال' جلد ۱' شعبہ اقبالیات' پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج' لاہور' ۲۰۰۶۔

☆ صابر' ڈاکٹر ایوب' محمد سہیل عمر' علامہ اقبال کا تصور اجتہاد' اقبال اکادمی' لاہور' ۲۰۰۸ء۔

☆ عبداللہ' ڈاکٹر سید' مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ' بزم اقبال' لاہور' ۱۹۹۹۔

☆ عبدالحکیم' ڈاکٹر خلیفہ' فکر اقبال' بزم اقبال' لاہور' ۱۹۹۲ء۔

☆ فراقی' ڈاکٹر تحسین' اقبال: چند مباحث' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۹۷ء۔

☆ لاہوری' ضیاء الدین' آثارِ سرسید' اشتیاق اے' مشتاق پریس' لاہور' ۲۰۰۷۔

☆ لاہوری' ضیاء الدین' نقش سرسید' اشتیاق اے' مشتاق پریس' لاہور' ۲۰۰۶ء۔

☆ ندوی' ابوالحسن علی' انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر' مجلس نشریات اسلام' کراچی' ۱۹۸۶ء۔

❁❁❁

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ
ایک علمی اور فقہی جائزہ(۴)

مقالہ نگار: پروفیسر حافظ احمد یارؒ

باب سوم

قرآن اور تحفّظِ مصالح یتامیٰ

سورۃ النساء کے دوسرے رکوع میں احکامِ میراث بیان کیے گئے ہیں اور پہلا رکوع تمام تر یتامیٰ کی پرورش ونگہداشت‘ ان کی کفالت وحفاظت کے طریقوں‘ ان سے حسنِ سلوک اور ان کے بارے میں خوفِ خدا کی تعلیم وتاکید پر مشتمل ہے۔ یتامیٰ کے بارے میں احکام بیان کرتے کرتے وراثت کے بنیادی اصولوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝﴾ (النساء)

’’ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں‘ تھوڑا ہو یا بہت‘ مَردوں کا حصہ ہے‘ اور (ایسا ہی) ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے‘ (اور یہ) حصہ (ہمارا اپنا) ٹھہرایا ہوا (ہے)۔‘‘

پھر ان مجمل اصولوں کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے دوبارہ تین آیات میں یتامیٰ کی طرف بالخصوص توجہ دلائی گئی ہے اور ان میں سے آخری دو آیات تو خصوصاً اپنی قوتِ تاثیر اور اندازِ تعبیر و انذار کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ ناممکن ہے کہ بے حس سے بے حس آدمی بھی انہیں پڑھ کر یتامیٰ کے بارے میں چونک نہ اٹھے:

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝﴾ (النساء)

’’اور ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس بات سے ڈریں کہ اگر وہ بھی اپنے پیچھے (ایسی ہی) کمزور اور ناتواں اولاد چھوڑ جاتے تو انہیں ان کے متعلق (کیسا) فکر ہوتا۔ پس چاہیے کہ اللہ سے ڈریں اور معقول بات کریں۔ یقیناً وہ لوگ جو ظلم سے یتیموں کا مال کھاتے ہیں‘ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں‘ اور جلد دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔‘‘

☆ آیاتِ میراث سے قبل یتامیٰ کے متعلق یہ آیات کیا اس طرف رہنمائی نہیں کرتیں کہ احکام میراث کو یتامیٰ کے معاملے سے کچھ خاص تعلق ہے؟ کیا قانونِ میراث کی تمہید میں یتامیٰ کے متعلق ایسی واضح ہدایات اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتیں کہ اگر قانون کی کچھ اصطلاحی پیچیدگیاں یتامیٰ کے بارے میں مشکلات پیدا کر دیں تو تم محض قانون پر (اور اس کی کلیت پر) مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جانا۔ یتامیٰ کی مصلحتوں کا تحفظ بہر حال تم پر لازمی ہوگا۔ قرآن کس قدر دردناک الفاظ میں یتامیٰ کی طرف توجہ کے لیے ترغیب دلاتا ہے اور کن خوفناک الفاظ کے ساتھ ان کے حقوق سے غفلت برتنے والوں کو ڈراتا ہے۔

☆ اس کے بعد مزید تدبر کیجیے۔ آیاتِ میراث میں ہر حکم کے بعد وصیت اور قرض کی ادائیگی کی تاکید کی گئی ہے۔ قرض کی وجہ تو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن وصیت کو اس پر بھی ہر دفعہ مقدم کیوں کیا گیا ہے؟ کیا یہ وارثوں کی تنبیہ کے لیے نہیں ہے کہ کہیں وصیت کو قرض سے معمولی نہ سمجھ لینا۔ یہ حقیقت ہے کہ وارثوں پر قرضِ میت ادا کرنا چنداں گراں نہیں گزرتا، جتنا وصیت کا نفاذ شاق گزرتا ہے، کیونکہ اس میں ایک چیز بغیر کسی عوض کے ہاتھ سے جارہی ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمادی کہ دیکھو بلحاظ سرعت و وجوبِ اداء کے وصیت بھی قرض کے مانند ہے، اور جس کے لیے مالِ میراث میں وصیت ہے وہ وارث سے بھی مقدم حقدار ہے۔

☆ آیاتِ میراث میں نفاذِ وصیت کی بار بار تاکید سے خود بخود ذہن میں آتا ہے کہ میراث اور وصیت کا گہرا تعلق ہے، بلکہ سورۃ النساء کے ابتدائی دو رکوع بار بار پڑھ کر ذرا تدبر کریں تو دماغ میں فقط چار الفاظ گھومنے لگتے ہیں: یتامیٰ، میراث، وصیت اور قرض۔ کیا یہ آیات پکار پکار کر نہیں کہہ رہیں کہ اسلامی قانونِ میراث اور قانونِ وصیت بیک وقت نافذ ہونے چاہئیں؟ کیا یہ قرآن حکیم سے مذاق نہیں ہے کہ اس کے دو واجب العمل اور لازم وملزوم حکموں میں سے صرف ایک کو نافذ کیا جائے اور دوسرے کو ترک کیا جائے؟ ذرا غور وفکر سے کام لیں تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ اسلامی قانونِ وراثت اور قانونِ وصیت ہر دو صحیح نتائج پیدا کرنے میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ایک کا کام اجتماعی مصالح کی نگہداشت ہے تو دوسرا اس اجتماعیت اور عمومیت (general principles) کے اندر انفرادی اور شخصی مصالح (particular cases) کو نظر انداز ہونے سے روکتا ہے — وارث کے لیے بغیر رضامندی دیگر ورثاء اور بغیر معقول وجوہ کے وصیت کر کے اس کو قانونی حق سے زیادہ دینا منع ہے، اور غیر وارث رشتہ دار کو محض قانون کی عمومیت کے رحم پر چھوڑنے کی بجائے اس کے لیے وصیت کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں قوانین کے ساتھ ساتھ چلنے میں جو ہم آہنگی اور موزونیت ہے وہ ایک کے ساقط کر دینے سے کہاں برقرار رہ سکتی ہے۔

آیاتِ میراث میں تو وصیت کے اجراء ونفاذ پر زور دیا گیا ہے۔ اب وصیت کرنے کے متعلق قرآن حکیم کا حکم ملاحظہ کیجیے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ لْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٨٠﴾﴾ (البقرۃ)

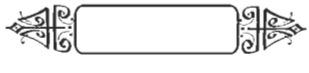

''(مسلمانو!) تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کا اخیر وقت آجائے اور وہ بطورِ ترکہ کچھ مال و دولت چھوڑ رہا ہو تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں منصفانہ وصیت کر جائے۔ متقی لوگوں کو ایسی وصیت کرنا ضروری ہے۔''

کس قدر واضح حکم ہے' لیکن افسوس ہے کہ بعض علماء آیاتِ میراث اور حدیث ((لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ))[1] کی بنا پر اس حکم کی منسوخی کے قائل ہونے کی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے' حالانکہ آیاتِ میراث اور حدیث زیادہ سے زیادہ صرف اس کے کچھ حصہ کی تخصیص کرتی ہیں' کیونکہ نہ تو تمام اقرباء ہمیشہ وارث ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں (مثلاً بحالتِ کفر) والدین بھی وارث نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

وقيل : ان الآية مخصوصة لان الاقربين اعم من ان يكونوا وارثاً، وكانت الوصية واجبة لجميعهم فخص منها من ليس بوارث بآية الفرائض و بالحديث لا وصية لوارث[2]

''اور ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت (منسوخ نہیں بلکہ) مخصوص ہے' کیونکہ اقرباء کا لفظ ورثاء سے زیادہ عام ہے۔ اور (پہلے تو) ان سب اقرباء کے لیے وصیت واجب تھی' لیکن آیت میراث اور حدیث لا وصیة لوارث سے (وجوبِ وصیت کے لیے) غیر ورثاء مخصوص کر دیے گئے۔''

دراصل قائلین نسخ کی نظریں وصیت کی حکمتوں اور مصلحتوں کو نہ پا سکیں[3] اسی لیے علماء کے ایک گروہ نے نہ صرف اس آیت کے متعلق نظریہ نسخ کا بطلان کیا بلکہ ہمیشہ وصیت کے واجب اور لازمی ہونے پر زور دیا۔[4]

علامہ ابن حزمؒ اندلسی لکھتے ہیں۔

وفرض على كل مسلم ان يوصى لقرابة الذين لا يرثون اما لرق واما لكفر واما لان هنالك من يحجبهم من الميراث او لانهم لايرثون، فيوصى لهم بما طابت به نفسه لا حد فى ذلك ..... فان اوصى لثلاثة من اقاربه المذكورين اجزأه[5]

''ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے ان رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے جو (کسی مانع شرعی مثلاً) غلامی یا کفر کی وجہ سے وراثت نہ پا سکتے ہوں' یا جو کسی دوسرے وارث کی وجہ سے محجوب ہو رہے ہوں یا (کسی اور باعث سے) وارث نہ بن سکتے ہوں۔ پس ایسے لوگوں کے لیے وہ وصیت کرے جس قدر اس کا جی چاہے' اس میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اور اگر کم از کم تین ایسے رشتہ داروں کے لیے وصیت کر دے تو اس نے فرض ادا کر دیا۔''

علامہ موصوف نے کبار تابعین میں سے ان بزرگوں کے نام دیے ہیں جو غیر وارث اقرباء کے لیے وصیت کرنا واجب قرار دیتے تھے۔ چند ایک نام یہ ہیں: عبداللہ بن طاؤس' قتادہ' سعید بن المسیّب' مسروق' سالم بن یسار' علاء بن زیاد' عبدالملک بن یعلی اور ایاس بن معاویہ وغیرہ۔ اور جو لوگ وجوبِ وصیت کے قائل نہیں ان پر سخت تنقید کرتے ہوئے آخر پر لکھتے ہیں:

ان هذا لمن قبيح التدليس فى الدين و ليت شعرى اى شيء فى هذا ما يبيح ان لايوصى لقرابته[6]

''یہ بات (کہ وصیت کرنا واجب نہیں) تدلیس فی الدین (یعنی دین کے بارے میں دھوکہ بازی کرنے) کی بدترین مثال ہے۔ کاش کوئی مجھے بتا سکتا کہ آخر اس بارے میں (ان کے پاس) کون سی ایسی

شے (دلیل) ہے جس سے رشتہ داروں کے لیے وصیت نہ کرنا جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟''

پھر آگے چل کر آیت وصیت کے متعلق نسخ کے قائلین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

..... فقد قال الباطل وقفا مالا علم له به، وقال على الله تعالى ما لا يعلم، وترك اليقين وحكم بالظنون، وهذا محرم بنص القرآن (۷)

''.....تو (جو اس آیت کے نسخ کا قائل ہوا) اس نے جھوٹ کہا اور ایک ایسی بات پر اڑا جس کے متعلق وہ بالکل بے خبر ہے اور اس نے اللہ تعالیٰ پر ایسی بات کہہ دی جس کا اسے کچھ علم نہیں' اور اس نے یقین کو چھوڑا اور گمان وظن کی بنا پر (ایک) فیصلہ کر لیا' حالانکہ ایسا کرنا نص قرآن کی رو سے قطعاً حرام ہے۔''

اگرچہ آیت وصیت کے الفاظ ''كُتِبَ عَلَيْكُمْ'' اور ''حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ' خود ہی اپنے مفہوم (ایجابِ وصیت) کی دلالت پر برہانِ قاطع ہیں' لیکن سنت سے اس کی مزید تاکید ثابت ہوتی ہے۔ شیخینؒ نے بطریق نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہما مندرجہ ذیل حدیث کی تخریج کی ہے:

((مَا حَقُّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُرِيْدُ اَنْ يُوْصِيَ فِيْهِ يَبِيْتُ لَيْلَتَيْنِ اِلَّا وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوْبَةٌ عِنْدَهُ))(۸)

''کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس کوئی شے (مال وغیرہ) قابلِ وصیت ہو اور (پھر بھی) دو راتیں اس پر بغیر تحریری وصیت پاس ہونے کے گزر جائیں۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو اس حدیث کے راوئ اول ہیں' فرمایا کرتے تھے:

مَا مَرَّتْ عَلَيَّ لَيْلَةٌ مُنْذُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ ذٰلِكَ اِلَّا وَعِنْدِيْ وَصِيَّتِيْ (۹)

''جب سے میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے سنا' کوئی رات مجھ پر ایسی نہیں گزری کہ میرے پاس اپنی وصیت موجود نہ رہی ہو۔''

اسی طرح حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما وصیت کے متعلق بہت سختی کیا کرتے تھے۔(۱۰)

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وجوبِ وصیت کے قائلین کا مسلک کس قدر اقرب الی القرآن اور قرینِ صواب ہے۔

پھر اس کے ساتھ ہی اگر آپ یتامیٰ کے متعلق قرآن حکیم کے احکام پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں بہت کم مقام ایسے ہیں جہاں گناہ اور برائی کے بیان میں یتامیٰ پر سختی یا ان سے غفلت' ان کی حق تلفی' ان کی دل شکنی' ان سے سخت کلامی اور ان پر ظلم وغیرہ کا ذکر موجود نہ ہو' اور اسی طرح بہت کم مقام ایسے ہیں جہاں نیکی اور بھلائی کے بیان میں یتامیٰ کی امداد و پرورش' ان کی تربیت' ان کی حفاظت و کفالت' ان کے معاملات میں دیانت و تقویٰ' ان کے احوال وحقوق کی نگہداشت اور ان سے ہمدردی وغم خواری وغیرہ کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

یتامیٰ کے متعلق قرآن کے ان تمام مجموعی احکام کو (جن سے کوئی معمولی قرآن دان بھی ناواقف نہیں ہے اور جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری تطویل کا باعث ہوگی)(۱۱) ان آیاتِ میراث و وصیت کے ساتھ ملا کر تدبر کیجیے تو کم از کم یتامیٰ اور پھر خصوصاً محجوب الارث یتامیٰ کے بارے میں تو وجوبِ وصیت پر آپ کو شرحِ صدر حاصل ہو جائے گا۔

الغرض قانونِ وراثت ایک عمومی وکلی قانون ہے جس کا مقصد عمومی و اجتماعی مصلحتوں کی نگہداشت ہے۔ ایسے کلی قانون میں شخصی و انفرادی مصالح کی مراعات ناممکن ہوتی ہے۔ (اور یہ قوانین کلیہ کے مزاج کا خاصہ ہے' چاہے وہ وضعی ہوں یا الہامی) لیکن یہ قرآن کی حکیمانہ بصیرت کا اعجاز ہے کہ وہ انفرادی اور شخصی مصالح کو بھی اجتماعی وعمومی مصالح کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیتا۔ چنانچہ قرآن کا قانونِ وصیت اس کے قانونِ وراثت کے تتمہ کی حیثیت رکھتا ہے' جس کے ذریعے سے نہ صرف محجوب الارث اقرباء (جن میں سے ایک یتیم پوتا بھی ہے) بلکہ اولاد خنثی مشکل' مفقود الخبر اشخاص' غیر مسلم والدین اور بہت سے دوسرے ایسے اشخاص کی انفرادی مصلحتوں کا تحفظ کیا جاسکتا ہے جو اگرچہ وراثت کے کلی قانون کی رو سے نقصان اٹھا سکتے ہیں' لیکن جن کی خبر گیری اور ادائیگیٔ حقوق بہرحال واجب ہے۔

حواشی اور حوالہ جات

(۱) خیال رہے کہ یہ حدیث روایتاً درایتاً کسی طرح اعتراضات سے خالی نہیں ہے۔ (ا) حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ حدیث مرفوع تو ہے لیکن شرط بخاری پر ثابت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس عنوان (لاوصیة لوارث) سے ایک باب تو باندھا' لیکن اس میں حدیث کی بجائے ابن عباس ؓ کا ایک قول نقل کیا ہے' جو معناً عنوانِ باب کی تائید کرتا ہے (بخاری' ج ۲' ص ۱۸۷)۔ ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' دارقطنی اور احمدؒ نے اسے مختلف اسناد سے روایت کیا ہے' لیکن ان اسناد میں سے کوئی بھی اعتراض سے خالی نہیں۔ مسلم نے اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی اور موطا مالک میں بھی یہ حدیث موجود نہیں (اگرچہ اس مضمون کا فتویٰ موجود ہے)۔ گو مجموعی طور پر یہ روایات حدیث کی اصل کو مضبوط کرتی ہیں' بلکہ امام شافعیؒ نے تو ''الامّ'' میں اسے متن متواتر تک کہہ دیا ہے۔'' (ملخص از حاشیہ بلوغ المرام' ص ۱۹۹)

(ب) فیض الباری شرح بخاری میں صاف لکھا ہے کہ یہ حدیث بالاتفاق ضعیف ہے (فیض الباری' ج ۳' ص ۴۰۹) اس کے بعد ابن القطان کی اس بحث کا ذکر کیا ہے کہ حدیث ضعیف پر جب امت عملاً اجماع کرلے تو کیا وہ صحیح کا درجہ حاصل کرلیتی ہے یا نہیں؟ (صاحبِ فیض الباری اپنا رجحان اس گروہ کی طرف بتلاتے ہیں جو اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔)

الغرض بلحاظِ اسنادِ روایت یہ حدیث ہرگز اس درجہ کو نہیں پہنچتی کہ اس سے آیت قرآنی کو منسوخ تو کجا مخصوص یا مقید بھی کیا جاسکے اور صاحب فیض الباری کا رجحان بھی مضار و مفاسد سے خالی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ((لَاایْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ)) وغیرہ کی قسم کی احادیث کو نفیٔ کمال پر محمول کیا جاتا ہے' اسی طرح اس حدیث سے بغیر کسی معقول وجہ کے کسی وارث کو بذریعہ وصیت کچھ زیادہ دینا ناجائز ثابت ہوگا۔ لیکن جب عقلاً و شرعاً قابل قبول وجوہ موجود ہوں تو وارث کے لیے بھی وصیت کرنے سے یہ حدیث نہیں روک سکتی۔ کیونکہ ''ظاہر کتاب'' سے مطلق وجوب وصیت ثابت ہوتا ہے۔ بغیر کسی ''قطعی حجت'' کے اسے ''قطعیت کے ساتھ'' مقید نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) بلوغ المرام' حاشیہ' ص ۱۹۹ (بحوالہ فتح الباری)

(۳) اس پر مفصل بحث کے لیے دیکھئے: تفسیر المنار' ج ۲ ص ۱۳۴ ببعد

(۴) یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سورۃ المائدۃ جس کا نمبر ترتیب نزول کے لحاظ سے ۱۱۲ ہے (اس کے بعد صرف سورۃ التوبہ اور النصر نازل ہوئیں) اس میں بھی وصیت کا ذکر موجود ہے۔ (المائدہ:۱۰۶)

(۵) المحلیٰ، ج۹، ص۳۱۴، مسئلہ نمبر ۱۷۵۱ (۶) ایضاً

(۷) ایضاً (۸) مسلم، ج۶، ص۷۰ و بخاری، ج۲، ص۱۸۵

(۹) مسلم، ج۶، ص۷۰، نیز المحلیٰ، ج۹، ص۳۱۳، مسئلہ نمبر ۱۷۴۹

(۱۰) المحلیٰ، ج۹، ص۳۱۲

(۱۱) قرآن حکیم میں حسبِ ذیل (۲۲) مقامات پر یتیم و یتامیٰ کا ذکر آیا ہے —— البقرۃ:۸۳، ۱۷۷، ۲۱۵، ۲۲۰۔ النساء:۲، ۳، ۶، ۸، ۱۰، ۱۲۷۔ الانعام:۱۵۲۔ الانفال:۴۱۔ بنی اسرائیل:۳۴۔ الکہف:۸۲۔ الحشر:۷۔ الدھر:۸۔ الفجر:۱۷۔ البلد:۱۵۔ الضحیٰ:۶، ۹۔ الماعون:۲

باب چہارم

قانونِ وصیت کی ضرورت

قرآن کے احکامِ وصیت میں پوشیدہ حکمتیں اور مصلحتیں اور آیاتِ میراث میں نفاذِ وصیت کی بار بار تاکید اس بات کی مقتضی ہیں کہ جہاں اسلامی قانونِ وراثت جاری ہو وہاں لازماً اسلامی قانونِ وصیت بھی نافذ ہو۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وراثت کے ساتھ وصیت کا قانون نافذ نہ کرنا صریحاً احکامِ قرآنی کی خلاف ورزی ہے۔ تعجب ہے کہ جو لوگ یتیم پوتے کو وراثت دلوانے میں اس قدر سرگرداں ہیں وہ اس طرف کیوں توجہ نہیں دیتے۔ جس سے نہ صرف یتامیٰ، بلکہ بیوہ بہنوں، مفلس و نادار بھائیوں اور دوسرے محتاج و قابل امداد اقرباء کے لیے آسان وسہل تر قانونی صورت امداد پیدا ہوسکتی ہے —— اگر حکومت قانونِ وراثت کے ساتھ ہبہ و وصیت کے اسلامی قانون بھی نافذ کرے اور بھاری ٹیکسوں اور عدالتی فیسوں کی ان غیر اسلامی رکاوٹوں اور تنگیوں کو دور کر دے، جو ان قوانین کے نفاذ کو عملاً مشکل بنا دیتی ہیں، تو ملک میں شاذ ہی کوئی محروم الارث پوتا نظر آئے گا۔

چونکہ وجوبِ وصیت کا مسئلہ امت کے مایہ ناز علماء کے ایک گروہ کے مختاراتِ فقہیہ میں سے رہا ہے، اس لیے اس بارے میں حکومت کے لیے مزید قانون سازی کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے، مثلاً اگر کسی ایسے محجوب الارث یتیم پوتے کے لیے جس کو اس کا دادا بذریعہ ہبہ یا وصیت کچھ نہ دے سکا ہو —— اس کے دادا کی جائیداد سے ایک حصہ بطور وصیت دینا قانوناً واجب قرار دے دیا جائے —— تو یہ قانونِ وراثت میں کسی طرح فٹ نہ ہو سکنے والے نظریہ قائم مقامی کی نسبت بدرجہا زیادہ سہل العمل اور مضرات و مفسدات سے نسبتاً محفوظ طریق کار ہوگا۔

اس کی ایک مثال حکومت مصر کے قانون میں موجود بھی ہے —— حکومت مصر نے اپنے ایکٹ نمبر ۷۱۔ ۱۹۴۶ء کی رو سے ملک میں جو قانون وصیت نافذ کیا ہے اس میں اس قسم کی وصیت کے لیے خاص دفعات رکھی ہیں۔ چنانچہ اس کی دفعہ ۷۶ یوں ہے:

اذا لم يوص الميت لفرع ولده الذی مات فی حياته اومات معه ولوحكما' بمثل ماكان يستحقه هذا الولد ميراثا فی تركة لو كان حيا عند موته —— وجبت للفرع فی التركة وصية بقدر هذا النصيب فی حدود الثلث' بشرط ان يكون غيروارث و ان لا يكون الميت قد اعطاه بغير عوض من طريق تصرف آخر قدر مايجب لهُ وان كان ما اعطاه اقل منه وجبت له وصية بقدر ما يكمله

''جب میت اپنی اس اولاد کی اولاد کے لیے جو اس کی زندگی میں مرچکی ہے یا وہ اس کے ساتھ مری ہو یا اس پر قانوناً موت کا حکم لگایا جا سکتا ہو' اس قدر مال کی وصیت نہ کر مرا ہو جتنا اس (مرنے والی) اولاد کا حق ہوتا اگر وہ (متوفی) اولاد اس (میت) کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوتی —— تو اس (متوفی اولاد) کی اولاد کے لیے ترکہ میت میں سے $\frac{1}{3}$ کی حد کے اندر اندر اس کا وہ ممکن حصہ بطور وصیت دینا واجب ہوگا۔ (یعنی اگر وہ متوقع حصہ ترکہ کے $\frac{1}{3}$ سے کم ہی کم میں پورا ہو گیا تو اسے تمام $\frac{1}{3}$ نہیں دے دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ملے گا) لیکن شرط یہ ہے کہ وارث نہ بن رہا ہو اور نہ ہی (میت) اسے کسی دوسرے طریقے سے بغیر کسی عوض کے (ھبہ) اس کے واجب حصہ کے برابر مال دے چکا ہو۔ اور اگر (اس طرح مال) دیا تو ہو لیکن وہ اس کے واجب حصے سے کم ہو تو صرف اتنے کے لیے وصیت واجب سمجھی جائے گی جس سے اس کا حصہ پورا ہو جائے۔''

وتكون هذه الوصية لا هل الطبقة الاولی من اولاد البنات ولاولاد الا بناء من اولاد الظهور وان نزلوا' علی ان يحجب كل اصل فرعه دون فرع غيره' وان يقسم نصيب كل اصل علی فرعه وان نزل قسمة الميراث' كما لو كان اصله او اصوله الذين يدلی بهم الی الميت ماتوا بعده و كان موتهم مرتبا كترتيب الطبقات(۱)

''اور یہ وصیت (واجبہ) بیٹیوں کی اولاد میں سے صرف پہلے طبقہ (نواسوں نواسیوں) اور بیٹوں کی صلبی اولاد کے لیے نیچے تک (پوتوں' پڑوتوں' سکڑوتوں تک) نافذ ہوگی' اس طرح سے کہ ہر اصل اپنی فرع کو تو محجوب کرے گا' لیکن دوسرے کی فرع کو محجوب نہ کر سکے گا اور ہر اصل کا حصہ اسی کی فرع پر (اور اسی طرح نیچے تک) بطریق میراث تقسیم ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ گویا اس اصل کی موت جس کے واسطے سے یہ میت کے رشتہ دار ہیں' اس میت کی موت کے بعد واقع ہوئی۔ اور اگر نیچے اوپر کئی مر چکے ہوں تو اسی طرح مرنے کی ترتیب بھی طبقہ وار سمجھی جائے گی۔''

اس کے ساتھ ہی اس قانون کی دفعہ نمبر ۷۸ میں تصریح کر دی گئی ہے کہ اگر میت اپنی ایسی محجوب الارث اولاد الاولاد کے لیے تو کوئی وصیت نہ کر مرا ہو' لیکن کسی اور (اجنبی) کے لیے وصیت کر گیا ہو تو بھی یہ وصیت نافذ العمل نہیں ہوگی جب تک ترکہ کے ۱/۳ میں سے محجوب الارث اولاد الاولاد کا حصہ پورا نہیں کر لیا جائے گا۔ اگر کچھ بچ رہا تو بقیہ اس اجنبی موصٰی لہ (جس کے لیے وصیت کی گئی) کو دیا جائے گا' ورنہ اسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔

ذیل میں ہم مصری قانونِ وصیت کی ان دفعات کے اطلاق کو چند مثالوں سے واضح کرتے ہیں تاکہ اس کی افادیت ظاہر ہو جائے۔(۲)

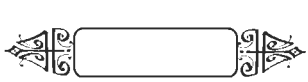

مثال نمبر۱

متوفیٰ

(۳)	(۲)			(۱)
دونواسے (ایک ہی بیٹی سے)	دوپوتے (ایک ہی بیٹے سے)	بیوی	ماں	بیٹا

اس صورت میں ''وصية واجبة'' پوتوں اورنواسوں کے لیے قائم ہوگی۔لیکن اگرچہ ان کی اصل یعنی بیٹا نمبر۲اور بیٹی نمبر۳ کا حصہ کل جائیداد کے $\frac{۱}{۳}$ سے زیادہ ہوتا تھا' تاہم وصیت صرف $\frac{۱}{۳}$ میں جاری ہوگی اور وہ $\frac{۱}{۳}$ دو پوتوں اورنواسوں میں۲:۱(بیٹا:بیٹی) سے تقسیم ہوگا۔پس دو پوتوں کو $\frac{۱}{۳}$ کا $\frac{۲}{۳} = \frac{۲}{۹}$ اور دونواسوں کو $\frac{۱}{۳}$ کا $\frac{۱}{۳} = \frac{۱}{۹}$ مال ملے گا۔اب باقی $\frac{۲}{۳}$ بیٹے' ماں اور بیوی میں حسب میراث تقسیم ہوگا تو ماں کو $\frac{۲}{۳}$ کا $\frac{۱}{۶} = \frac{۱}{۹}$ — اور بیوی کو $\frac{۲}{۳}$ کا $\frac{۱}{۸} = \frac{۱}{۱۲}$ —— اور بیٹے کوا۔ $(\frac{۲}{۹} + \frac{۲}{۹} + \frac{۱}{۹} + \frac{۱}{۱۲}) = \frac{۱۷}{۳۶}$ ملے گا۔

خیال رہے کہ تہائی سے زیادہ میں وصیت نافذ نہ کرنے کے باعث پوتوں اورنواسوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ ہر پوتے کو اس کے ''اصلی حصہ'' سے صرف $\frac{۱۱}{۳۶۰}$ حصہ کم مل رہا ہے۔

مثال نمبر۲

متوفیٰ

دوپوتے (ایک ہی مردہ بیٹے سے) | بیٹا | بیٹا | بیٹی

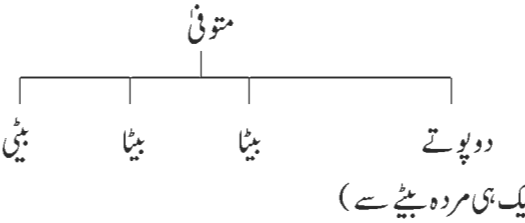

متوفیٰ نے اس مثال میں دیے ہوئے نقشے کے مطابق وارث چھوڑے اور کسی اور (اجنبی) آدمی کے لیے وصیت بھی کر گیا ہے تو اب یہ وصیت نافذ نہیں کی جائے گی' بلکہ $\frac{۱}{۳}$ میں سے پہلے دو پوتوں کو ان کے باپ کا حصہ دیا جائے گا اور یہ $\frac{۲}{۷}$ بنتا ہے۔پس دونوں پوتے $\frac{۲}{۷}$ حصہ جائیداد مناصفةً (بحصہ برابر) لیں گے اور موصی لہ کو بقایا $\frac{۱}{۳} - \frac{۲}{۷} = \frac{۱}{۲۱}$ حصہ (صرف) دیا جائے گا۔

دونوں بیٹے اور بیٹی بقایا $\frac{۲}{۳}$ کو۲:۲:۱ سے تقسیم کرلیں گے' دونوں بیٹے $\frac{۸}{۱۵}$ بحصہ برابر لیں گے اور بیٹی کو $\frac{۲}{۱۵}$ ملے گا —— گویا اجنبی موصیٰ لہ کو بھی کچھ مل گیا اور باقی ہر ایک کو بھی پورا حق مل گیا۔

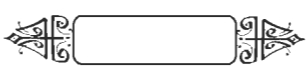

مثال نمبر۳

متوفیٰ

(۱)	(۲)	(۳)	(۴)	(۵)	(۶)	(۷)	(۸)
یx	بیٹاx	بیٹی	بیٹی	بیٹی	بیٹا	بیٹا	بیٹا

(۹)	(۱۰)
بیٹا	بیٹی

(نوٹ: متوفی کی زندگی میں مرنے والوں کے سامنے x کا نشان ہے)

اس مثال میں بیٹا نمبر(۹) اور بیٹی نمبر(۱۰) یعنی نواسے اور پوتی کے لیے وصیت واجبہ قائم ہوگی۔ پس اگر تمام زندہ ہوتے تو ان کے ماں اور باپ کو علی الترتیب $\frac{1}{21}$ اور $\frac{2}{21}$ ($\frac{1}{6}$) حصہ ملتا۔ اور یہ حصہ کل ترکہ کے $\frac{1}{3}$ سے کم ($\frac{1}{14}$) ہی میں پورا ہو گیا' لہٰذا تمام $\frac{1}{3}$ حصہ ترکہ ان میں تقسیم نہیں ہوگا بلکہ بیٹا نمبر۹ (نواسہ) اپنی ماں کا حصہ $\frac{1}{12}$ لے گا اور بیٹی نمبر۱ (پوتی) اپنے باپ کا حصہ $\frac{1}{6}$ پائے گی۔

اس صورت میں بھی کسی کو نقصان نہیں ہوا۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قانونِ وصیت کے نفاذ اور بصورت خاص محجوب الارث پوتے کے لیے وصیت واجب قرار دینے سے یہ مسئلہ ایک حد تک نہایت عمدہ اور مزاجِ قرآنی سے قریب تر طریقے پر حل ہو جاتا ہے' لیکن یہ صرف قانونِ وصیت کی عام ضرورت اور اس میں ایک خاص ترمیم اور اس کی کیفیت و نتائج کا ذکر تھا۔ اگلے باب میں ہم اسلامی قانونِ وراثت کا ان ہی پہلوؤں سے جائزہ لیں گے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) المواریث الاسلامیہ' صفحہ ۱۳۷

(۲) یہ مثالیں کتاب المواریث الاسلامیہ کے آخری حصہ (صفحات ۱۴۰ تا ۱۴۵) میں دی ہوئی تشریحات سے منتخب کی گئی ہیں۔

باب پنجم

اسلامی قانونِ وراثت میں ترمیم کے امکانات

قرآن حکیم کا اعلانیہ دعویٰ ہے کہ وہ انسانی حالات کی اصلاح کے لیے نازل کیا گیا ہے اور انسانی حالات ہر لحہ تغیّر پذیر ہیں۔ اسلام زندگی کا دستور العمل ہے اور زندگی ساکن و جامد شے نہیں ہے' بلکہ زمان و مکان کے ساتھ ساتھ اس کے ضروریات و مقتضیات بدلتے چلے جاتے ہیں —— لیکن اس کے باوجود زندگی محض اور مطلق

تغیر و انقلاب ہی کا نام نہیں ہے۔ اس کی ایک مستقل و محکم بنیاد اور مضبوط و ناقابلِ تبدیل اساس بھی ہے جسے قرآن لفظ ''فطرت'' سے تعبیر کرتا ہے اور قرآن ہی آسمانی ہدایت کا وہ آخری ایڈیشن ہے جس میں زندگی کے ان اندرونی اور بیرونی تقاضوں کو نہایت خوبی سے ملحوظ رکھا گیا ہے —— اور کیوں نہ ہو ﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾﴾ (الملک)

اسلامی قانون انسانی فکر و نظر اور فقہ و دانش کی رفتارِ ترقی کو روک نہیں دیتا' بلکہ اس کے لیے صرف نشانِ راہ متعین کر دیتا ہے' تاکہ وہ بے راہ روی سے بچا رہے۔ یہ نشانات راہ' یہ غیر متبدّل اصول اسلامی قانون کی اپنی ہستی اور انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے اٹل اور قطعی ہیں' لیکن اس کے باوجود وہ اس خوبی اور حکمت سے وضع کیے گئے ہیں کہ ان کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لیے تنگ نہیں ہوسکتا۔ اسلامی قانون کی اس بے اندازہ وسعت اور ترقی پذیری پر صحابہؓ' تابعین' تبع تابعین اور مسلمانوں کے فکری عروج کے زمانے کے فقہاء و ائمہ مجتہدین کے اجتہادات' تاویل و تعبیر احکام میں اختلافات' اور قیاس و استحسان پر مبنی استنباطات گواہ ہیں —— صرف گواہ ہی نہیں' بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا ہے:

> *The teaching of Quran that life is a process of progressive creation neccessiates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted to solve its own problems* (1)

یہ بات بلاخوف لومۃ لائم کہی جاسکتی ہے کہ کسی مستنبط و مجتہد فیہ مسئلہ میں کسی امام اور مجتہد کے قول کو قطعیت کے ساتھ حرفِ آخر نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی کسی امام و مجتہد نے کبھی اپنے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے۔ بلکہ بعض علماء (مثلاً شوکانی اور کرخی) تو صحابہؓ کے مدرک بالقیاس فیصلوں کو بھی خاص حالات و ضروریات میں ترک کر دینا جائز سمجھتے ہیں (۲)۔ خصوصاً جبکہ مقصد کسی مصلحت شرعیہ کی حفاظت ہو اور وہ مصلحت قطعی ضروری ہو تو مصلحت کو نص پر بھی ترجیح دی جاسکتی ہے (۳)۔ خود خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بعض اقدامات اس بارے میں مشعل راہ ہیں —— مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شربِ خمر کی حد ۴۰ کوڑے مقرر کی' حالانکہ اس سے پہلے کوئی سزا مقرر نہیں تھی۔ بعد میں اسی سزا کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (اور بقولِ بعض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے) بمشورہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ۸۰ کوڑے کر دیا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایسے متعدد اجتہادات ملتے ہیں (۴) مثلاً (۱) انہوں نے مؤلفۃ القلوب کا حصہ صدقات سے ساقط کر دیا' حالانکہ یہ نص ثابت ہے۔ (۲) عام المجاعہ (۱۸ھ کا مشہور قحط) میں انہوں نے حد سرقہ (قطع ید) ساقط کر دی تھی۔ (۳) اُمّ الولد کی بیع روک دی۔ (۴) مفقود الخبر کی زوجہ کی تطلیق کا حکم دیا جبکہ اسے گم ہوئے یا اس کی خبر نہ آئے چار سال گزر چکے ہوں۔ (۵) مکاتبت کے حکم کو وجوبی قرار دیا۔ وغیر ذلک۔

الغرض اس قسم کے متعدد واقعات اور نظائر موجود ہیں جن سے وقت کی ضروریات اور حالات کے اقتضاء

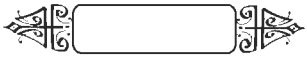

سے فقہی فیصلوں کو بدلنے کا ثبوت ملتا ہے اور ہر زمانے میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً مختلف فیہ مسائل میں تو اس کی گنجائش بہت زیادہ ہے (۵)۔ لیکن اس بارے میں کچھ احتیاطیں ضروری ہیں۔ خصوصاً ایک تو یہ کہ فیصلہ کرنے والے اشخاص دینی تعلیم اور ذہنی تربیت کے بلند معیار پر ہوں اور عربی زبان کی مہارت، شریعت کے جملہ احکام میں گہری بصیرت، معاملاتِ زندگی کا عمدہ فہم، قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہ اور ذاتی تقویٰ اور خوفِ خدا کی صفات جس شخص میں ہوں صرف اسی کی بات قابل قبول سمجھی جائے۔

اور دوسری بات یہ کہ نئے حکم سے قرآن کے کسی صریح حکم کی خلاف ورزی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اور بالخصوص ایسا حکم جس کی عدم تعمیل پر عذاب کی وعید موجود ہو۔

ان امور کی روشنی میں اسلامی قانونِ وراثت میں جس قدر حصہ اجتہاد و قیاس پر مبنی ہے وہ کسی وقت بھی نظر ثانی کا محتاج ہو سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں دادا کی میراث کے متعلق سو مختلف رائیں قائم کیں اور بعض مسائل کے متعلق تو وہ مرتے دم تک کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکے (۶)۔ آج بھی کوئی اسلامی حکومت ماہرین فن (علمائے دین) کی مدد سے قرآن و سنت کی روشنی میں اور حدود اللہ کے اندر رہ کر قانون میں ترمیم یا تبدیلی کر سکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ایک مثال حکومت مصر کے جدید قانونِ وراثت میں ملتی ہے۔

اس قانون میں مراتب استحقاقِ وراثت (۷) میں موالی العتاقہ اور ان کے عصبات کو چھٹے نمبر پر رکھا گیا ہے، حالانکہ بالاتفاق ان کو تیسرے درجہ پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ذوی الارحام کے بعد پانچویں نمبر **الردّ علی احد الزّوجین** کو رکھا گیا ہے، حالانکہ اہل سنت کے چاروں ائمہ زوجین پر رد کے کسی صورت میں قائل نہیں ہیں (۸)۔ لیکن حکومت مصر نے اس بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا ہے— پھر بعض خاص مسائل مثلاً ''مسئلہ اکدریہ'' اور ''مسئلہ مشترکہ'' وغیرہ میں بھی کسی خاص فقہی سکول کی پابندی نہیں کی گئی (۹)۔ محجوب الارث یتیم پوتے کے مسئلہ کو حکومت مصر نے اپنے قانون وصیت واجبہ کے ذریعے حل کیا ہے، قانون وراثت میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

اس وقت ہمارے سامنے غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ قانونِ وراثت میں اس غرض کے لیے کسی ترمیم وغیرہ کا امکان ہے یا نہیں؟

جہاں تک محجوب الارث یتیموں کے مستقبل کی حفاظت کے لیے ان کو اپنے دادا کی جائیداد سے حصہ دلانے کے لیے کوئی قانونی ذریعہ مہیا کرنے کا تعلق ہے تو یہ مقصد خلافِ اسلام نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ عین تقاضائے تعلیم قرآن ہے۔ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ چونکہ یتیم پوتا محجوب الارث ہے اس لیے اس کو کچھ دلانے کا ذریعہ پیدا کرنا خلافِ احکامِ اسلام ہے تو یہ سراسر اس کی جہالت اور فہم قرآن سے بالکل کورا ہونے کا ثبوت ہوگا۔ ونعوذ باللہ ان نکون من الجاھلین!

اب اس طرف آیئے کہ وہ ''قانونی ذریعہ'' کیا ہو؟ ممکن قانونی ذریعے چار ہو سکتے ہیں: (۱) ہبہ

(۲) وصیت (۳) نفقہ (۴) وراثت۔ یہاں ہمیں مؤخرالذکر سے بحث کرنا مطلوب ہے—— یہ بالکل بدیہی سی بات ہے کہ یتیم پوتا اپنے دادا یا دادی کی جائیداد سے ''بطور وراثت'' اسی صورت میں کچھ پا سکتا ہے جبکہ اسے اپنے باپ کا قائم مقام تسلیم کر لیا جائے' لیکن ہم اس بات پر مفصّل بحث کر چکے ہیں کہ بطور قاعدہ کلیہ کے اصولِ نیابت اسلامی قانونِ وراثت میں کسی طرح بھی نہیں چل سکتا۔ اور جہاں تک اس ''کلیت'' کا تعلق ہے فقہائے متقدمین سے قرآن کا مفہوم سمجھنے میں ہرگز کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ (۱۰)

اب ایک صورت یہ رہ جاتی ہے کہ یتیم پوتے کی خاطر قانونِ وراثت میں ایک استثناء تسلیم کیا جائے (۱۱) مثلاً یوں کہ ''صرف اس اولاد کی صورت میں جو اپنے ماں یا باپ کی زندگی میں مر جائیں اور اپنے پیچھے اپنی فرع (اولاد) بھی چھوڑ جائیں تو بطور استثناء ان کی موت کو اپنے مورث کی موت کے بعد فرض کر کے ان کا حصہ نکالا جائے اور پھر ان کے موجودہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے''—— اگرچہ اس قسم کی قانون سازی میں ایک خود رایانہ پہلو پایا جاتا ہے جو مفاسد سے خالی نہیں ہو سکتا (کیونکہ قرآن کے متعدد قسم کے مقرر کردہ وارثوں میں سے ہم صرف ایک قسم کے لیے یہ حق تسلیم کر رہے ہوں گے) تاہم محض اس بنا پر کہ اس کا مقصد ایک مصلحت شرعی —— مصالح یتامیٰ —— کا تحفظ ہے' لہٰذا اس قسم کے استثناء کو روحِ اسلام کے منافی نہ سمجھتے ہوئے جائز گردان بھی لیں۔ لیکن آیئے اب غور کیجیے کہ اس طرح یتیم کو حاصل کیا ہوگا؟

جب آپ اس طرح کسی مرنے والے (کی موت مورث کے بعد فرض کر کے اس) کا حصہ نکالیں گے تو وہ تمام کا تمام حصہ اس کی اولاد میں ہرگز تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ از روئے قرآن اولاد کی موجودگی میں بھی ماں یا باپ اور خاوند یا بیوی میں سے جو بھی موجود ہوں گے ان کا حصہ نکالنا ضروری ہے۔

گویا قرآن کی تقسیمِ وراثت کی رو سے اولاد کے ہوتے ہوئے بھی نصف کے قریب یا بعض دفعہ نصف سے زیادہ جائیداد دوسرے وارث لے سکتے ہیں' مثلاً جب میت کی اولاد کے ساتھ اس کے والدین اور بیوی بھی موجود ہوں تو $\frac{۱۱}{۲۴}$ حصہ تو یہ لے جائیں گے اور باقی $\frac{۱۳}{۲۴}$ اولاد میں تقسیم ہوگا۔ اسی طرح اگر میت عورت ہو اور اولاد کے ساتھ والدین اور خاوند بھی چھوڑ رہی ہو تو اس کے ترکے کا صرف $\frac{۵}{۱۲}$ حصہ اس کی اولاد کو ملے گا۔

اب اگر ہم مندرجہ بالا استثناء کو تسلیم کرتے ہوئے ایک مردہ بیٹے کا حصہ نکالیں اور اس کی اولاد کے علاوہ اس کی بیوی اور ماں بھی زندہ موجود ہوں تو ان کو $\frac{۱}{۸} + \frac{۱}{۶} = \frac{۷}{۲۴}$ یعنی تہائی کے قریب لازماً دینا پڑے گا (۱۲) تو اس طرح یہ نیا استثناء تسلیم کر لینے کے باوجود بھی یتیم پوتے کو بہت کم صورتوں میں اپنے باپ کی پوری جائیداد مل سکتی ہے۔

لیکن اس کے برعکس ہم دیکھ چکے ہیں کہ قانونِ وصیت کی رو سے بعض صورتوں میں اس کی مصلحتوں کے پیشِ نظر اس کے متوقع حصے سے زیادہ (ثلث کی حد کے اندر رہتے ہوئے بھی) دیا جا سکتا ہے۔ اور اگر مصری قانون کی طرح ''وصیت واجبہ'' نافذ کی جائے تو بھی شاذ صورتوں میں اسے اپنے متوقع حصہ سے کم مل سکتا

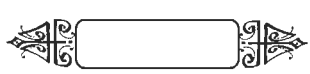

ہے[۱۳]۔ اور پھر قانون وصیت سے صرف یتیم پوتے کا ہی نہیں' بلکہ اور بھی محتاج اقرباء کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ نیز اس سے قرآن کے ایک حکم کی تعمیل بھی ہو جاتی ہے۔

اس طرح سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی قانون ہبہ و وصیت کے ہوتے ہوئے قانون وراثت میں خاص محجوب الارث پوتے کے لیے کسی استثناء یا ترمیم وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی' اور نہ ہی یہ زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اصل ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اسلامی قانون وراثت کے ساتھ فوراً اسلامی قانون وصیت نافذ کیا جائے اور ایسی خاص صورتوں میں جبکہ دادا نہ تو زندگی میں کچھ دے سکا ہو اور نہ ہی وصیت کر سکا ہو (اور قانون وصیت کے نفاذ کے بعد ایسے واقعات (cases) بہت کم بلکہ شاذ ہی پیش آئیں گے) تو اس کے لیے چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) حکومت خود ایسے یتامی کی کفالت اپنے ہاتھ میں لے اور یہ سب سے بہترین اور صحیح ترین اسلامی صورت ہے۔

(۲) وارث چچاؤں پر نفقہ تا حد بلوغ واجب قرار دیا جائے۔ یہ صورت بھی ہماری فقہ میں موجود ہے اور موجودہ زمانے میں بعض ممالک میں اس کے مماثل قانون بھی ملتے ہیں' مثلاً انگلستان میں فرزند اکبر کی صورت میں باقی کے افراد نفقہ پاتے ہیں۔

(۳) مصری قانون کی طرح ایسی خاص صورت کے لیے ''وصیت واجبہ'' کے نفاذ کا اختیار عدالت کو دیا جائے۔

(۴) ایسی مخصوص صورتوں کے لیے اس قسم کا ''استثناء'' تسلیم کیا جائے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے' لیکن ایسا ''استثناء'' اس صورت میں جائز ہوسکتا ہے جبکہ وہ واقعی ''ما یثبت بطریق الضرورۃ فیقدر بقدر الضرورۃ'' کے فقہی اصول کے مطابق ہو' یعنی زیادہ سے زیادہ قرآنی حدود میں مقید ہو۔ اصول قائم مقامی کے بآسانی چلانے کے لیے صرف ''نسبی رشتہ داروں'' پر اس کا اطلاق کرنا یقیناً وصریحاً خلافِ قرآن ہوگا اور اسے ہرگز روا نہیں رکھا جاسکتا۔

ہماری رائے میں مؤخر الذکر ہر دو صورتیں ''جائز'' اور ''مباح'' کی حد تک ہیں' جبکہ وصیت کا قانون نافذ کرنا اور یتامیٰ کی کفالت خود حکومت کا اپنے ذمہ لینا ''ضروری'' اور ''واجب'' کے درجہ میں ہیں —— اور واجب اصلی کو نظر انداز کر کے ضرورتاً جائز چیز کو واجب کرنے کے لیے بے چین ہونا صحیح اسلامی روح کی بجائے بعض دوسرے عوامل کے اثرات کی غمازی کرتا ہے۔

حواشی اور حوالہ جات

(1) Reconstruction of Religious Thought in Islam,page168

(۲) خطباتِ اقبال (انگریزی)' ص ۱۲۸ (۳) اصول التشریع الاسلامی' ص ۸۳

(۴) الفاروق' ص ۱۷۱ و ص ۲۳۸۔ نیز اصول التشریع الاسلامی' ص ۸۵

(۵) بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس مسئلہ پر امت میں متعدد نظریات موجود ہیں ان میں سے ہر ایک نظریہ مخصوص حالات وضروریات میں اس مسئلہ کا بہترین اور صحیح ترین حل قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً خلافت وامارت کے مسئلے میں سنیوں کے نظریہ قرشیت اور شیعوں کے نظریہ امامت کے مقابلے پر آج خوارج کا ''نظریہ انتخاب'' کس قدر قرین صواب نظر آتا ہے۔

(۶) الفاروق، ص ۲۳۲

(۷) عام مروّجہ ترتیب کے لیے دیکھئے مقالہ ہذا کے حصہ اول کے بابِ چہارم ''وارثوں کے طبقات'' کا حاشیہ نمبر ۱۰

(۸) البتہ اگر ایسا رشتہ ہو جس میں فرض اور تعصیب جمع ہو جائیں، مثلاً خاوند ابن عم شقیق (سگے چچا کا بیٹا) بھی ہو تو اس صورت میں $\frac{1}{2}$ کے علاوہ باقی بطور عصبہ پا سکتا ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(۹) تفصیلات کے لیے دیکھئے کتاب المواریث الاسلامیہ ص ۱۶ و ص ۴۳۔۴۴

(۱۰) بلکہ جو حضرات اس مسئلہ کے متعلق کل تک ''خلافِ قرآن'' ہونے کے فقہی ثبوت دے رہے تھے، خود ان پر بھی اصولِ نیابت کی کلیت کی غلطی، بلکہ لغویت واضح ہوگئی ہے اور وہ خود بھی اس اصول کو صرف ''نسبی رشتہ داروں'' تک محدود کرنے کے قائل ہو گئے ہیں۔ (دیکھئے طلوعِ اسلام، ماہ مارچ ۱۹۵۴ء ص ۵۸ تا ۶۰) حالانکہ یہ ''نسبی'' کی تخصیص بجائے خود غیر قرآنی بلکہ صریحاً خلافِ قرآن ہے۔ نیز دیکھئے: مقالہ ہذا کے اگلے صفحات میں آنے والا ضمیمہ الف

(۱۱) جس طرح اخیافی بھائیوں کی وراثت کے متعلق فقہ فرائض میں ایک استثناء موجود ہے، دیکھئے مقالہ ہذا کے حصہ اول کا بابِ سوم۔

(۱۲) اس قسم کے استثناء میں صرف نسبی ''رشتہ داروں'' کو وارث بنانا اور بیوی یا ماں کو نظر انداز کرنا صریحاً خلافِ قرآن ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی، لیکن تعجب ہے کہ وہ لوگ جو اپنی فکر کی بنیاد صرف قرآن پر رکھنے کے مدعی ہیں وہ بھی میاں بیوی جیسے تعلق وراثت کو جو قرآن کا صریح حکم ہے اور دنیا بھر کے قوانین وراثت میں اپنی نظیر آپ ہے ـــــ نظر انداز کرنے پر رضامند ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ''اجتہاد'' سراسر خلافِ قرآن ہے اور محض جاہلانہ تحکم ہے۔ (میرا اشارہ رسالہ طلوع اسلام، ماہ مارچ ۱۹۵۴ء (ص ۵۸۔۶۰) کی طرف ہے)

(۱۳) توضیحات کے لیے دیکھئے، مقالہ ہذا کے حصہ دوم کا باب چہارم، مثال ۱، ۲ اور ۳۔

ضمیمہ ''الف''

پنجاب اسمبلی کے اجلاس منعقدہ ۳ دسمبر ۱۹۵۳ء میں چودھری محمد اقبال صاحب چیمہ ایم ایل اے کی طرف سے ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا، جس کا مقصد اسلامی قانون وراثت (پنجاب شریعت ایکٹ ۱۹۴۸ء) میں ایسی ترمیم کرنا ہے جس کی رو سے یتیم پوتوں کو بھی حصہ مل سکے۔ اگرچہ اصل مسئلہ پر اپنا نقطہ نظر ہم اصل مقالہ میں پیش کر چکے ہیں، تاہم چونکہ چیمہ صاحب کا مجوزہ بل بھی ہمارے موضوعِ بحث سے خاص تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اس بل پر بھی ایک نظر ڈال لیتے ہیں تاکہ یہ بحث تشنہ تکمیل نہ رہ جائے۔

چیمہ صاحب کے مجوزہ ترمیمی بل کے وجوہ ومقاصد یوں بیان کیے گئے ہیں:

''یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کے لیے اصولِ نیابت بالکل اجنبی ہے۔ اس وقت

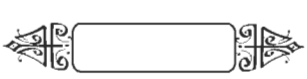

مورث کی وفات سے پہلے مرنے والے بیٹے یا بیٹی اور بھائی یا بہن کی اولاد کو اس مورث کی جائیداد سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ شریعت میں کوئی ایسی واضح ممانعت موجود نہیں ہے کہ یہ اشخاص مورث کی دوسری اولاد کی موجودگی میں محجوب الارث ہی ٹھہریں گے۔ قانون (وراثت) کا مروجہ نظریہ یتیم پوتوں پوتیوں، نواسوں نواسیوں، بھتیجوں بھانجوں وغیرہ کی زندگی بڑی اندوہناک بنا دیتا ہے۔ پس قانون کو اسلامی روح سے سازگار بنانے کے لیے یہ ترمیم تجویز کی جاتی ہے۔''

افسوس ہے کہ اس بیان میں بہت کچھ خلط مبحث کر دیا گیا ہے، تاہم مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں:

(۱) یہ محض خیال ہی نہیں حقیقت ہے کہ اصول قائم مقامی اسلامی قانونِ وراثت کے لیے واقعی اجنبی اور ناقابلِ عمل ہے۔ (۱)

(۲) بھائی بہن کی اولاد کو بھی اس ترمیم سے مستفیض کرنا تعجب خیز ہے۔ اسلامی قانون وراثت ان کو اپنے ماں باپ کی جائیداد سے کب محروم کرتا ہے کہ ان کو بھی محجوب الارث کی صف میں لا کھڑا کر دیا جائے —— آخر مرحوم بیوی یا خاوند کے وارثوں کو بھی کیوں نہ اس ترمیم میں شامل کر لیا جائے؟

(۳) اگر شریعت تیرہ سو برس تک امت سے مخفی نہیں رہی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانونِ شریعت کی رو سے بیٹے بیٹی اور بھائی بہن کی اولاد اپنے سے اعلیٰ درجہ کے وارث کی موجودگی میں محجوب الارث ہی قرار دی گئی ہے۔ چونکہ یہ اصول قائم مقامی کے بغیر وارث نہیں ہو سکتے اور اصول قائم مقامی پر عمل قرآن کے واضح احکام کو نظر انداز کیے بغیر ہو نہیں سکتا، لہٰذا محجوب الارث کا مسئلہ قرآن کا واضح حکم نہ سہی لیکن اس کے واضح احکام کی تعمیل کا لازمی تقاضا (corollary) ضرور ہے۔

اگر یہ کہنے کی بجائے کہ ''شریعت میں کوئی ایسی واضح ممانعت موجود نہیں ہے کہ یہ اشخاص مورث کی دوسری اولاد کی موجودگی میں محجوب الارث ہی ٹھہریں گے''—— یوں کہا جاتا کہ ''چونکہ اسلامی قانون وراثت کی مخصوص وضع و مزاج کے باعث اصول قائم مقامی اس میں جاری نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے بعض محجوب الارث وارثوں اور خصوصاً یتیم پوتوں کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، لہٰذا ان یتامیٰ کے معاشی مستقبل کی حفاظت و بہبود کے لیے، جو از روئے قرآن ضروری ہے، فلاں تجویز (مثلاً قانون وصیت یا حکومت کی کفالت یا ایک مخصوص استثناء وغیرہ) پیش کی جاتی ہے''—— تو یہ کہنے میں البتہ کوئی بات بھی تھی۔ جب آپ کے خیال میں شریعت میں ممانعت ہی نہیں تو یہ بل ہی کس لیے تجویز کیا گیا؟ تفنن طبع کے لیے یہاں بل زیر بحث پر آنریبل مسٹر جسٹس جے آر چسن صاحب جج ہائی کورٹ لاہور (Hon'ble Mr. Justice J. Ortcheson) کی رائے جو انہوں نے بحیثیت ایک فاضل قانون دان ہونے کے ظاہر کی ہے —— کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"In my opinion if the principle laid down in the bill is in accordance with the Shariat, it is unneccessary, or if it is against the Shariat, it is invalid." (2)

یہ تو بل کے اغراض و مقاصد پر تبصرہ تھا۔ اب ذرا اصل مطلوبہ ترمیم ملاحظہ فرمائیں:

—''جب کوئی بیٹا بیٹی' یا بھائی یا بہن اپنے مورث سے وراثت پانے سے پہلے فوت ہو جائے — تو ان کا حق وراثت بوقتِ تقسیم وراثتِ مورث ان (فوت شدہ) کے اپنے ''جانشینوں اور وارثوں'' کی طرف منتقل کیا جائے گا (اور یہ سمجھ لیا جائے گا) کہ گویا اشخاص متذکرہ بالا اپنے مورث (آخری مالک) کی وفات کے فوراً بعد مرے تھے۔''

مقالہ کے حصہ دوم کے مطالعہ کے بعد ان غلط فہمیوں اور مشکلات و مفسدات کا دریافت کر لینا دشوار نہیں ہے جو یہ ترمیم اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے (۳)۔ دراصل یہ ترمیم بالکل اسی اصول پر مبنی ہے جس سے ہم مفصل بحث کر چکے ہیں (۴)۔ یعنی یہ کہ ''ہونے والے وارثوں'' کی موت کی صورت میں ان کا حصہ ان کے اپنے وارثوں اور جانشینوں کو منتقل کر دیا جائے —— البتہ ان ''ہونے والے وارثوں'' میں سے صرف بیٹا بیٹی بھائی بہن منتخب کیے گئے ہیں' معلوم نہیں والدین اور زوجین کو کیوں اس رعایت سے محروم کیا جا رہا ہے؟

دراصل ترمیم میں ''کوئی بیٹا یا بیٹی'' اور ''ان کے جانشینوں اور وارثوں'' کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ محرک اور مجوز کے ذہن میں وارث اور جانشین کا مطلب اولاد اور صرف اولاد ہے —— (جو خالص ہندو نظریہ ہے) قرآن حکیم کے چھ بنیادی وارثوں (بیٹا' بیٹی' ماں' باپ' بیوی' خاوند) کو ذہن میں رکھنے کے بعد اس ترمیم کے مہمل' ناقابل عمل اور قرآن کے واضح اور ظاہر احکام میراث سے لاعلمی پر مبنی ہونے میں کچھ شبہ نہیں رہ جاتا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اس ترمیم کے الفاظ میں ترمیم کر کے اسے اس قسم کی استثناء کی شکل دی جائے جس کا ذکر مقالہ ہٰذا کے حصہ دوم کے باب پنجم میں ہو چکا ہے' لیکن بہر حال پھر بھی یہ اس مسئلہ کا تسلی بخش حل نہیں ہوگا اور فوائد سے زیادہ اس میں خطرات و مفسدات مضمر ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ اس قسم کے استثناء کی ضرورت بھی اس وقت درپیش آ سکتی ہے (۵) جب قانونِ وراثت' قانونِ ہبہ اور قانونِ وصیت تینوں نافذ ہوں اور پھر بھی کچھ ایسے واقعات (cases) سامنے آئیں جسے کسی خاص ''آسمانی افتاد'' نے ان تمام قوانین سے متمتع نہ ہونے دیا ہو۔ اور پھر ''ایسی مخصوص صورتوں'' کے حل کے لیے بھی یہ سوچا جائے گا کہ اس میں سب سے پہلے وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو اسلام کی نظروں میں زیادہ ضروری ہے' مثلاً حکومت کی کفالت —— اور اگر اس بہتر طریقہ کے اختیار کرنے میں کوئی قابلِ قبول عذر اور مجبوریاں موجود ہوں تب اس صورت میں بے شک اس قسم کے استثناء کو زیرِ غور لایا جا سکتا ہے اور جائز بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو سب سے آخری چیز ہے اسے سب سے پہلے لانا سراسر تحکم اور نادانی ہے۔ اسلامی احکام و مسائل پر بحث کرتے وقت ضد' ہٹ دھرمی اور فتح و شکست کے نظریوں سے سوچنے کی بجائے تقویٰ' خوفِ خدا' اتباعِ رسول ﷺ اور احترامِ دین کے جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱﴾ (الحدید)

(اس کے بعد آگے ضمیمہ ''ب'' بھی ضرور ملاحظہ فرمائیں!)

ضمیمہ ''ب''

اگرچہ مقالہ ''یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ'' خالص علمی ضرورت اور مقصد کے ماتحت لکھا گیا ہے' لیکن چونکہ یہ بحث ایک خالص قرآنی حکم سے متعلق تھی اس لیے بحیثیت ایک طالب علم کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک مسلمان کے—— اور دراصل سب حیثیتوں سے مقدم یہی حیثیت ہے —— یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ جب سے میں نے اس مسئلہ کی تحقیقات' اور اسے سمجھنے کی کوشش شروع کی تھی' میں اپنی اکثر نمازوں کے ساتھ بالالتزام اللہ تعالیٰ سے بصدقِ دل دعا مانگتا رہا ہوں کہ وہ اس مسئلہ کے متعلق راہِ حق اور صورتِ صواب پر میرے دل کو مطمئن کر دے۔ اس دوران میں بار بار میری رائے بدلتی بھی رہی ہے' لیکن بالآخر مسلسل مطالعہ' ذاتی بحث و مباحثہ اور آزادانہ غور و فکر کے بعد میں نے اس مسئلہ کے متعلق مختلف آراء کا تجزیہ کر کے جو کچھ شرح صدر کے ساتھ سمجھا ہے اسے مقالہ میں پیش کر دیا ہے —— اپنی بساط بھر پوری علمی سعی و کوشش اور اپنی پُرخلوص دعاؤں کے بھروسے پر کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے گمراہی سے محفوظ رکھا ہوگا۔ تاہم میں یہی کہتا ہوں کہ اگر میں نے حق سمجھا اور کہا ہے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کی مہربانی ہے —— اور اگر خدانخواستہ میں نے کوئی غلط رائے قائم کی ہے یا غلط بات بیان کی ہے تو وہ میری طرف سے ہے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ اور اس کے لیے اہل حق و ہدایت سے اصلاح کا اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور عفو کا طلبگار رہوں۔

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۸﴾

(آل عمران)

حواشی اور حوالہ جات

(۱) دیکھئے مقالہ ہذا کے حصہ دوم کا باب دوم' فصل دوم: اصول قائم مقامی پر بحث۔

(۲) پنجاب مقننہ (اسمبلی) کی طبع کردہ پبلک آراء اس مسئلہ پر (انگریزی میں) ص ۲۔

(۳) اس ضمن میں ''opinon'' یعنی ''پنجاب'' مقننہ کی طبع کردہ پبلک آراء میں آنریبل جسٹس کیکاؤس (ص ۱) چوہدری فضل حق سیشن جج کیمبلپور (ص ۷۵) اور سینئر سول جج مظفر گڑھ (ضمیمہ آراء ص ۳۔۷) کی آراء قابل ملاحظہ ہیں۔

(۴) مقالہ ہذا کے حصہ دوم کا باب دوم' فصل دوم: اصول قائم مقامی پر بحث۔

(۵) اور اس قسم کے استثناء کو ہر صورت میں اور ہر قیمت پر ناجائز کہنا اور مطلقاً اس کے تصور کو ہی سراسر خلاف قرآن سمجھ لینا بھی روح قرآن و اسلام سے بے خبری ہے۔ کیونکہ کسی ایسے مقصد شرعی کی حفاظت کرنا جس کا مقصد شرعی ہونا کتاب و سنت یا اجماع سے معلوم ہو اور اس کا مقصود ہونا دلائل کے مجموعہ و قرائن حالات سے معلوم ہو تو اس کی پیروی کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ یہی موالک کا استصلاح اور احناف کا استحسان ہے۔ اور متذکرہ بالا شرائط کے ساتھ یتیم کا مسئلہ یقیناً ایک ''مقصد شرعی'' بن جاتا ہے۔ (جاری ہے)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : منتخبات بیان القرآن

مصنف : ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مرتب : لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین

ضخامت: 438 صفحات قیمت: 800 روپے

ناشر: مرکزی انجمن خدام القرآن، K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی شائع کردہ ''بیان القرآن'' ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل ہے۔ رمضان المبارک کی راتوں میں نماز تراویح کے دوران ہر روز قرآن مجید کا جتنا حصہ پڑھا اور سنا جاتا ڈاکٹر صاحب اس کے معانی ومطالب سامعین پر واضح کرتے۔ یوں یہ ایک مفصّل تفسیر نہیں ہے بلکہ وقت کی اجازت کے مطابق قرآنی آیات کی مختصر وضاحت پر مبنی ہے۔ اس اختصار کے باوجود یہ سات جلدوں پر محیط ایک ضخیم کتاب ہے۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ بیان القرآن کے چیدہ چیدہ مقامات کو منتخب کر کے ایک جلد میں یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ کام کرنل عاشق حسین صاحب کے ہاتھوں انجام پایا۔ قاری کو اس کتاب کے مطالعے سے غیر معمولی اہمیت کی آیات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اور اس کے بار بار پڑھنے سے قرآن مجید میں دیے ہوئے اہم مسائل سے واقفیت ہو جائے گی اور مکمل بیان القرآن پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کی ''بیان القرآن'' کو اس قدر پذیرائی ملی کہ بہت کم عرصے میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ زیر تبصرہ ''منتخباتِ بیان القرآن'' کے کئی فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ بہت کم وقت میں قرآنی معلومات کے خصوصی اہمیت کے مضامین سے واقفیت ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ جو شخص فی الوقت بیان القرآن کی سات جلدیں خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ بھی منتخبات آسانی سے خرید کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں ''تعارف قرآن'' کے عنوان کے تحت قرآن مجید کے متعلق اہم باتیں ۳۸ صفحات میں سمو دی گئی ہیں، جس کے پڑھنے سے قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً منزلیں، سورتیں، رکوعات، نزولِ آیات کی کیفیت، مقصد نزولِ قرآن، قرآن کی محفوظیت، آیاتِ محکمات ومتشابہات، تاویل عام اور تاویل خاص، تفسیر وتاویل کا فرق، قرآن مجید کا منزّل من اللہ ہونا، قرآن اور

صاحب قرآن کا باہمی تعلق، رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن، قرآن حکیم کا دعویٰ اور چیلنج، قرآن حکیم سے ہمارا تعلق۔ اس آخری عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق جامعیت کے ساتھ بتائے گئے ہیں تاکہ قاری کے ذہن میں مستحضر رہے کہ کلام اللہ کے حقوق پورے کرنا ہر مسلمان کی اولین ذمہ داری ہے۔

اس طرح یہ کتاب قرآن فہمی کی ضرورت بڑی حد تک پوری کر دے گی۔ کتاب کی جلد مضبوط، ٹائٹل خوشنما، کاغذ سفید اور کمپوزنگ معیاری ہے۔

(۲)

نام کتاب : فضل الباری فی تکمیل صحیح البخاری

مصنف : پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

ضخامت: 358 صفحات قیمت: 630 روپے

ناشر دارالنور، اسلام آباد ملنے کا پتہ: مکتبہ قدوسیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی معروف دینی سکالر ہیں جو عربی، اردو، بنگالی، انڈونیشی، انگریزی، فارسی اور ترکی زبانوں میں درجنوں معیاری اسلامی کتب لکھ چکے ہیں۔ قرآن وسنت کی تعلیمات پر مشتمل یہ کتابیں اسلامی لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''فضل الباری'' اصلاً صحیح البخاری کے آخری باب کی شرح ہے مگر دیگر متعلقہ عنوانات پر بھی ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ کتاب کے آغاز میں امام بخاریؒ کے حالات زندگی کے ضمن میں ان کی سیرت بیان کی گئی ہے۔ پھر امام بخاری کا مقام ومرتبہ واضح کیا گیا ہے جو انہیں علمائے امت میں حاصل تھا۔ علم حدیث کے کے ساتھ ان کی خصوصی دلچسپی کے چند واقعات اور مشاہدات درج کیے ہیں۔ صاحب کتاب کے ذکر کے بعد صحیح البخاری کے تعارف کے ضمن میں یہ بات کافی ہے کہ یہ کتاب مستند ترین احادیث پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اُمتِ مُسلمہ کے ہاں قرآن مجید کے بعد سب سے قابل اعتماد اسلامی تعلیمات کا ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔

کتاب کے ایک حصے میں صحیح بخاری کی آخری حدیث کے راوی مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے جنہوں نے صرف تین سال صحبت نبوی میں گزارے۔ انہوں نے ۵۳۷۴ روایات بیان کی ہیں جو ہر دوسرے صحابی کی بیان کردہ روایات سے زیادہ ہیں۔ وفات نبوی کے بعد انہوں نے لمبی عمر پائی۔

کتاب کے آخری حصے میں صحیح بخاری کی آخری حدیث کے متن کی جامع تشریح کرتے ہوئے حدیث کے ہر حصے کے الفاظ کی فضیلت فوائد حدیث کے عنوان سے تفصیلاً بیان کی ہے۔ کتاب کے آخری صفحات میں فہرس المصادر والمراجع کے تحت ۱۲۴ عربی اور اردو کتب کے نام لکھے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کتاب کی جلد مضبوط اور ٹائٹل خوبصورت ہے۔ اعلیٰ درجے کی کمپوزنگ اور طباعت نے کتاب کی استفادی حیثیت کو بڑھا دیا ہے۔ ❁❁❁

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-An'am

(The Cattle)

(Recap of verses 56 – 70 of Surah Al-An'am and fresh exposition of verses 71 – 90 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 56 – 70 (inclusive) of Surah 6, Al-An'am

- ***The subject matter of verses 56 through 60 illustrates that Allah (SWT) alone has the Authority of passing judgement (in all possible meanings and realms) and He (SWT) alone knows the unseen.***

This section (verses 56 through 60) starts with a manifest declaration that the undue desires and wishes made by anyone ought to be explicitly responded with a negative answer by the believers, and that polytheistic belief is the root of all illegitimate sensual desires. The verses further elaborate that, The Holy Qur'an clearly and completely separates right from the wrong. Moreover, the verses clarify that all the proofs and signs brought by the Prophets *(AS)* originated by the Will of Allah *(SWT)* alone. The disbelievers questioned why it was that they had openly rejected a Prophet *(SAAW)* sent by Allah *(SWT)*, yet they had not been struck down by Allah's *(SWT)* wrath? The verses provide adequate answer for the reasons of the punishment and the wrath of Allah *(SWT)*. The verses elaborate that all kinds of retributions are with Allah *(SWT)* alone. He *(SWT)* gives respite to the unjust according to His *(SWT)* Own Knowledge, Wisdom and His *(SWT)* plan. Allah's *(SWT)* knowledge encompasses whatever exists in the land and the seas, which is one of the many proofs that Allah *(SWT)* is Omniscient. Therefore, the end of this section of verses evidently asserts Allah's *(SWT)* Knowledge of all things by referring to a record of all things of the past, present and future (in a Clear Book). The last verse (Verse 60) of this section states that by night, Allah *(SWT)* takes activity out of the human soul the same way as He *(SWT)* takes it by death. He *(SWT)* is also fully aware of what people do during the day. Then, Allah *(SWT)* will raise you up from your graves so that He *(SWT)* reckons you for what you spent your lives upon. It is so until the appointed time comes forth, which Allah *(SWT)* has assigned for raising the dead from their graves and giving them the fruit of their deeds. That is called the 'Hereafter'. As Allah *(SWT)* has resembled awakening people from sleep to raising them up after death, many exegetes of the Holy Qur'an have said that sleep too is a kind of 'death'.

- ***Verses 61 and 62 expound that Allah (SWT) has appointed guardian angels over His (SWT) entire mankind.***

These two verses (verses 61 and 62) emphasize on Allah's *(SWT)* complete and absolute conversance with the deeds of His *(SWT)* servants (believers as well as disbelievers) and that He *(SWT)* keeps their account minutely to be dealt with on the Day of Judgement, referring to the angels *(AS)* who keep watch and maintain a record of everything done by humans from life till death, i.e. all their movements, deeds and so on. The verses then go on to state that this account keeping continues until the ending moments of life, when death approaches and the angels take away the soul of that servant [although, Allah *(SWT)* does not need angels *(AS)* as 'recorders of deeds' or 'takers of souls', as He *(SWT)* is Omniscient and Omnipotent). The verses elaborate that these angels *(AS)* never neglect their duty and there is neither any shortcoming nor any defect in the duties that they perform. Moreover, the verses allude to events after the death of people, when they are taken towards the Divine Judgment and Allah's *(SWT)* reward or punishment. The Lord *(SWT)* is their Owner, their Master and The Guardian of their affairs. He *(SWT)* is the Judge, Who *(SWT)* does not judge but in Truth and Justice.

- ***The central theme of verses 63 through 67 is that Allah (SWT) alone delivers people from the calamities that befall them. Moreover, He (SWT) alone is the One (SWT) that takes the irredeemable transgressors to task by decreeing for them His (SWT) wrath in this world (and in the Hereafter).***

This section of the Surah (Verses 63 through 67) starts by elucidating the concept of 'The Light that Glitters in the Darkness.' The pagans are called towards the light of the Unity of Godhead (monotheism). The verses in the beginning of this section tell the Holy Prophet *(SAAW)* to question the pagans as to who delivers them from the darkness of the land and the seas. These verses allude to the physical as well as the spiritual darkness. In a nutshell, these kinds of cases, which happen to everybody, are windows to realize and accept the Unity of Godhead (monotheism). And, it is in this condition that

immediately the disbelievers make a covenant with that Great Source, promising that if He *(SWT)* delivers them from the danger, they will certainly be grateful of His *(SWT)* infinite blessings and will rely on none but Him *(SWT)*. The verses then command the Holy Prophet *(SAAW)* to tell them that Allah *(SWT)* will deliver them from these darknesses and from any other sorrow, as He *(SWT)* has delivered them frequently, but, after deliverance, the disbelievers pave again the path of polytheism and paganism.

This section of verses also elucidates that it is Allah *(SWT)* alone Who *(SWT)* possesses the ultimate Power, Control and Authority over all things. He *(SWT)* has full control over what causes harm or benefit to an individual. The concept of divine punishment is also elaborated and the Holy Prophet *(SAAW)* is commanded to threaten the sinners with three sorts of punishments. These chastisements come from the above and from beneath, the chastisement of dispute and the chastisement of fight and blood shedding. At the end of verse 65, in order that they may realize the Truth and return to it, it is added that these repeated signs from Allah *(SWT)* are for people so that they may understand and repent for their individual and collective sins. The last part of this section of verses indicates that the Quraysh and the pagans of Makkah belied the teachings of the Holy Prophet *(SAAW)*, despite the fact that all of these teachings are true and revealed unambiguously by Allah *(SWT)*. The crux of this part is that a Prophet *(AS)* is neither required to compel the people to see what they are not prepared to see nor to force into their hearts what they fail to comprehend. It is not a Prophet's *(AS)* task to chastise people for failing to see and comprehend the Truth. His *(AS)* task is merely to proclaim the Truth as distinct from the falsehood. If people fail thereafter to accept it, they will be overwhelmed by the very misfortunes against which that Prophet *(AS)* had warned them. Finally, Allah *(SWT)* warns the disbelievers of His *(SWT)* wrath and commands them to choose the right path. It is declared in the last verse of this section that whatever guidance Allah *(SWT)* and the Prophet *(SAAW)* provide to the people, there is finally a term for it, which will be accomplished at its appointed time, and they will see it happen soon.

- ***In verses 68 and 69, Allah (SWT) commands the believers not to sit in the company of those who argue (in doubt or refutation) about His (SWT) revelations and His Messenger's (SAAW) directives.***

These two verses (68 and 69) of the Surah command the believers (by addressing the Holy Prophet *SAAW*) that when they see that the arrogant, illogical opponents are mocking the Signs of Allah *(SWT)*, they must leave such gathering. They may join later when some other topic comes under discussion. It is further directed that in case a believer due to forgetfulness remains seated, he should leave the place the moment he remembers the above instruction.

In the light of verses 68 and 69 it is permitted to join the meeting of "unbelievers" with an intention to invite them towards the right path. To handle such a situation we should adhere to intellect of Islam.

To save others the Muslims are directed to sermonize the society of unbelievers, critics and the hypocrites by brilliant teachings of The Holy Qur'an, so that they may fear the Day of Account. To initiate such an important task the correct appreciation of the situation is one of the foundations of preaching of Islam. Those who embark on such mission they are required to be equipped with firm faith, piety and sound knowledge of Deen.

- ***In verse 70, Allah (SWT) commands the believers to not to associate with those who take their religion as a matter of amusement (and consider trivial the Deen of Allah SWT, the life in this world and the Judgement in the Hereafter).***

This verse (verse 70) has a simple and easily understandable message. The believers are told not to associate with those who consider religion (Deen) as a matter of amusement and of trivial in importance. The manner of taking religion 'for a play' under different circumstances may have forms as follows:

a. To have superstitious beliefs.

b. To consider religious laws to be impracticable.

c. Attempts made to justify sins.

d. Introducing innovations in Islamic practices.

e. Interpretation of The Holy Qur'an based on personal opinion.

f. Trying to delve frivolously into the allegorical verses and to follow those.

However, this verse makes it abundantly clear that true faith has no consistency with laziness, flattery, and playing with ideology. Moreover, the verse also clarifies that many a time admonishment is a means to being saved from the wrath and punishment of Allah *(SWT)*. When one reflects on the causes of his misfortunes, he certainly finds that the reason is his own self and his own deeds. The verse ends by declaring that those who do not mend their ways in this worldly life do not stop following Satan and keep declining the Truth of Islam, would face a painful chastisements in the Hereafter.

==========

Exposition of verses 71 - 90 of Surah Al-An'am

Verse 71

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ
الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ
وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ

"Say, "Shall we invoke instead of Allah that which neither benefits us nor harms us and be turned back on our heels after Allah has guided us? [We would then be] like one whom the devils enticed [to wander] upon the earth confused, [while] he has companions inviting him to guidance, [calling], 'Come to us.'" Say, "Indeed, the guidance of Allah is the [only] guidance; and we have been commanded to submit to the Lord of the worlds."

The verse addresses the Holy Prophet *(SAAW)* to tell the disbelievers, who invite the believers back to idolatry, whether they should worship the things that neither benefit them nor harm them, and, by abandoning the best religion (The Deen of Islam), turn back on their heels after Allah *(SWT)* has guided them and has shown them the straight path.

The continuation of the statement of the verse implies that if they return to idolatry they will be like such a person whom Satan has seduced and bewildered on the earth; although that person has righteous companions, who invite him towards the true guidance. Yet that person does not accept their invitation and does not go towards them. He has been so influenced by Satan that he is deprived of recognizing his own interests in this world and in the Hereafter and the difference between Truth and Falsehood.

In short, the only guidance that causes prosperity and comfort is Allah's *(SWT)* guidance that calls human beings to monotheism. Those who accept and follow that invitation which calls towards the Deen of Islam (total submission to Allah *SWT*) and provides guidance to trust all affairs to the One *(SWT)* – Who *(SWT)* is 'The Lord of the worlds' – are the ones who will be successful in the Hereafter.

Verse 72

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

"And to establish prayer and fear Him. And it is He to whom you will be gathered."

This verse is interconnected with the previous one and enjoins the believers (Muslims) to 'establish' prayer and avoid committing sins declared to be such by Allah *(SWT)* so that we do not face His *(SWT)* wrath and punishment. He *(SWT)* is the Lord *(SWT)* unto Whom *(SWT)* all humankind will be mustered on the Day of Judgment, and everybody will receive the reward or the retribution of one's own deeds.

Verse 73

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

"And it is He who created the heavens and earth in truth. And the day [i.e., whenever] He says, "Be," and it is, His word is the truth. And His is the dominion [on] the Day the Horn is blown. [He is] Knower of the unseen and the witnessed; and He is the Wise, the Acquainted."

It has been asserted in various places of the Qur'an that Allah *(SWT)* created the heavens and the earth 'In Truth'. This covers a wide range of meanings:

First, that the heavens and the earth have not been created just for the fun of it. This existence is not a theatrical play. This world is not a child's toy with which to amuse oneself as long as one wishes before crushing it to bits and throwing it away. Creation is rather an act of great seriousness. A great objective motivates it, and a wise purpose underlies it. Hence, after the lapse of a certain stage it is only 'Just' and 'Rational' for the Creator *(SWT)* to take full account of the work that has been done and to use those results as the basis for the next stage.

Second, it means that Allah *(SWT)* has created this entire system of the universe on solid foundations of the Truth. The whole of the universe is based on justice, wisdom and truth. Hence, there is no scope in the system for falsehood to take root and prosper. The phenomenon of the prosperity of falsehood which we observe, is to be ascribed to the Will of Allah *(SWT)*, Who *(SWT)* grants the followers of falsehood the opportunity, if they so wish, to expend their efforts in promoting unrighteousness, injustice and untruth. In the end, however, the earth will throw up all the seeds of untruth that have been sown, and in the final reckoning every follower of falsehood will see that the efforts he devoted to cultivating and watering this pernicious tree have all gone waste.

Third, it means that Allah *(SWT)* created this universe with justice. Allah *(SWT)* the Supreme authority is the Creator *(SWT)* of this universe. If it seems that anyone else is governing this world that is just an illusion. Only Allah *(SWT)* has the right to enforce His *(SWT)* will.

Moreover, 'His *(SWT)* dominion on the Day…' does not mean that the present dominion is not His *(SWT)*. The purpose of this statement is rather to stress that when the veil which keeps things covered during the present phase of existence will be lifted on the Day of Judgement and the Truth will become fully manifest, it will become

quite clear that all those who seemed or were considered to possess power and authority are absolutely powerless, and that the true dominion belongs to the One True God – Allah *(SWT)* Who *(SWT)* created the universe.

In what manner the Trumpet will be blown is impossible for us to grasp. What we know through the Qur'an is that on the Day of Judgement the Trumpet will be blown on Allah's *(SWT)* command, whereupon all creation will die. Then after an indefinite period of time - a period that is known to Allah *(SWT)* alone - the second Trumpet will be blown, whereupon all the people of all epochs will be resurrected and will find themselves on the Plane of the Congregation.

Ghayb (The Unseen) signifies all that is hidden from, and is beyond the ken of man's knowledge. Shahadah (Seen/Known), as opposed to ghayb, signifies that which is manifest and thus can be known to man.

Verse 74

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

"And [mention, O Muhammad], when Abraham said to his father Azar, "Do you take idols as deities? Indeed, I see you and your people to be in manifest error."

The incident relating to Prophet Abraham *(AS)* mentioned in this verse, and the ones that follow, is adduced in order to confirm and reinforce the view that the Companions *(RA)* as a result of invitation, preaching and the guidance of Holy Prophet Muhammad *(SAAW)* denounced the polytheism by shedding all false gods. They bowed their heads in obedience to the One True Lord *(SWT)* and Prophet Abraham *(AS)* did same in his *(AS)* time.

It suffices to say that all the Prophets *(AS)* were opposed to by their *(AS)* own people throughout the history. Those who deviated from the path of Prophets *(AS)* were lost in error.

At this point it should also be noted that Prophet Abraham *(AS)* was generally acknowledged by the Arabs to be their patriarch and their original religious leader. The Quraysh, in particular, were proud of

their devotion to Prophet Abraham *(AS)*, of being his *(AS)* progeny and of being servants to the shrine (Kaaba) built by him *(AS)*. Hence, the mention of Prophet Abraham's *(AS)* doctrine of monotheism, of his *(AS)* denunciation of polytheism and his *(AS)* remonstration with his polytheistic people, amounted to demolishing the very basis on which the Quraysh had prided themselves. It also amounted to destroying the confidence of the people of Arabia in their polytheistic religion. This also proved to them that the Muslims stood in the shoes of Prophet Abraham *(AS)* whereas their own position was that of an ignorant nation which had remonstrated with Prophet Abraham *(AS)* out of ignorance and folly.

Verse 75

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝

"And thus did We show Abraham the realm of the heavens and the earth that he would be among the certain [in faith]."

In the last verse (verse 74) Prophet Abraham *(AS)* denounces the idol worships of his *(AS)* father. In verse 75 it is informed that Prophet Abraham *(AS)* was strongly opposed to polytheism. But to strengthen his *(AS)* insight and that he *(AS)* might attain sublime certainty, he *(AS)* was informed of the profundity laws working behind the system and was shown the wonders of the heaven and the earth.

On the other hand the adversaries are told that they can observe Allah's *(SWT)* signs in the phenomena of the universe, just as Prophet Abraham *(AS)* could. The difference is that they see nothing, as if they were blind, whereas Prophet Abraham *(AS)* saw with open eyes. The sun, moon and stars which rise and set before their eyes day after day and night after night witness them as misguided at their setting as at their rising.

It is quite evident that polytheism did not consist merely of a set of religious beliefs and polytheistic rites; it rather provided the foundation on which the entire order of economic, cultural, political and social life rested during the times of Prophet Abraham *(AS)*. Likewise, the monotheistic mission which was undertaken by

Prophet Abraham *(AS)* was not merely directed against the practice of idol-worship. It had far wider implications, so much so that it affected the position of the royal family both as rulers and deities. It also affected the social, economic and, political status and interests of the priestly class, and the aristocracy in general, and in fact the entire fabric of the social life of the kingdom. To accept the teaching of Prophet Abraham *(AS)* meant that the entire edifice of the existing society should be pulled down and raised anew on the basis of belief in the One True God *(SWT)*. Hence, as soon as Abraham *(AS)* launched his *(AS)* mission, ordinary people as well as the privileged classes, ordinary devotees as well as Nimrud, all rose at once to oppose and suppress it.

Verses 76 through 79

Verses 76 through 79 of the Surah address a single theme and subject matter and it is advisable to understand the exposition of these verses simultaneously.

Verse 76

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝

"So when the night covered him [with darkness], he saw a star. He said, "This is my lord." But when it set, he said, "I like not those that set [i.e., disappear]."

Verse 77

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝

"And when he saw the moon rising, he said, "This is my lord." But when it set, he said, "Unless my Lord guides me, I will surely be among the people gone astray."

Verse 78

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

"And when he saw the sun rising, he said, "This is my lord; this is greater." But when it set, he said, "O my people, indeed I am free from what you associate with Allah."

Verse 79

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

"Indeed, I have turned my face [i.e., self] toward He who created the heavens and the earth, inclining toward truth, and I am not of those who associate others with Allah."

Once the Prophet Abraham *(AS)* was shown the realm of the heaven and the earth (verse 75), he *(AS)* became aware of the nature of the created objects i.e. stars, moon, and the sun. To prove the flimsiness and absurdity of the belief of his *(AS)* people, who worshiped stars, moon and the sun in addition to the idols, Prophet Abraham approached by degrees. He *(AS)* generated his *(AS)* reasons to reject the belief of his *(AS)* people.

The verse 76 to 78 provide testimony that Prophet Abraham *(AS)* temporarily called the star, moon, and the sun "my lord" once those remained visible during their natural course of revolution. He *(AS)* immediately denounced each, on their disappearance and told his *(AS)* people that "I like not those that set."

An object which is subject to a system cannot exercise control over others. Likewise, an object that moves is creatable and a creatable cannot be a god. The true God *(SWT)* is one Who *(SWT)* is not captive to a place, time and is also not temporary, limited and numerous.

Showing condescension to his *(AS)* people and without showing any religious prejudice against the belief of his *(AS)* people, Prophet Abraham *(AS)* encouraged the disbelievers to contemplate and to approach the truth in the light of facts brought to their knowledge about the false gods.

Prophet Abraham *(AS)* told them that whoever takes the heavenly objects as his gods is among the ones who have gone astray, and save the Grace and Mercy of Allah *(SWT)* there is no guide to the truth. The verse 79 elaborated that Prophet Abraham *(AS)* believed in Allah *(SWT)* alone, the Creator *(SWT)* of the heavens and the earth. It is He *(SWT)* Who *(SWT)* regularizes their movements.

Allah *(SWT)* specifies their way and appoints the times of their risings and settings. Hence, I (Abraham *AS*) have turned myself *(AS)*

wholly to His *(SWT)* Lordship *(SWT)* sincerely, and I (Abraham *AS*) am not one of the polytheists.

The Qur'anic term /'hanif/ (upright) is derived from /'hanafa/ with the sense of 'sincere' and 'without any deviation'.

Verse 80

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ
وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝٨٠

"And his people argued with him. He said, "Do you argue with me concerning Allah while He has guided me? And I fear not what you associate with Him [and will not be harmed] unless my Lord should will something. My Lord encompasses all things in knowledge; then will you not remember?"

The word used here is *'tadhakkur'*, which conveys the sense that somebody who had been either heedless or negligent of something suddenly wakes up to its true meaning. The purpose of Prophet Abraham's *(AS)* statement was to recall the polytheists to their senses by reminding them that their true Lord *(SWT)* was not uninformed about their deeds, for Allah's *(SWT)* knowledge encompasses everything.

Verses 81 and 82

Verses 81 and 82 of the Surah address a single theme and subject matter and it is advisable to understand the exposition of these verses simultaneously.

Verse 81

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ
الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٨١

"And how should I fear what you associate while you do not fear that you have associated with Allah that for which He has not sent down to you any authority? So which of the two parties has more right to security, if you should know?"

Verse 82

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

"They who believe and do not mix their belief with injustice – those will have security, and they are [rightly] guided."

These two verses indicate that the disbelievers of that time (of Prophet Abraham *AS*) did not deny the existence of God as the Creator *(SWT)* of the heavens and earth. Their real guilt was that they associated others in His *(SWT)* attributes and His *(SWT)* sovereignty over man. In the first place, Prophet Abraham *(AS)* himself *(AS)* clearly states that, they associated others with Allah *(SWT)* as His *(SWT)* partners. In the second place, the way in which Abraham *(AS)* mentions Allah *(SWT)* while addressing these disbelievers is suitable only for a people who did not deny the existence of Allah *(SWT)*. We must, therefore, regard as unfitting the opinion of those exegetes who try to explain this verse on the assumption that the people of Prophet Abraham *(AS)* either denied or were unaware of the existence of God altogether, and considered their own deities to be the exclusive possessors of godhead.

The expression 'and do not mix their belief with injustice...' led some companions *(RA)* of the Holy Prophet *(SAAW)* to the misapprehension that perhaps this 'injustice' signified 'disobedience'. But the Holy Prophet *(SAAW)* has made it clear that this injustice signifies shirk (associating others with Allah (*SWT)* in His *SWT* Divinity). The verse means, therefore, that they alone are fully secure and rightly-guided who believe in Allah *(SWT)* and do not mix their faith with any polytheistic belief and practice.

While in verse 81, this question was referred to indicating whether the monotheists are secured from the punishment of Allah *(SWT)*. Verse 82, in answer to that question, declares that those are more secured from the punishment of Allah *(SWT)* who have recognized Him *(SWT)* and testified to being totally subservient to Him *(SWT)*. Such people have recognized their duty and have not mixed their belief with polytheism. In short this group, which we call 'Believers' and 'Muslims' are the ones for whom Allah *(SWT)* has issued the decree of 'those who have found salvation'.

==========

Verse 83

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

"And that was Our [conclusive] argument which We gave Abraham against his people. We raise by degrees whom We will. Indeed, your Lord is Wise and Knowing."

This verse points to the entire former discussions that have been stated by Prophet Abraham *(AS)* upon the subject of Unity of Allah *(SWT)* and the act of opposition against polytheism. It also makes mention of the lofty degree bestowed on Prophet Abraham *(AS)* by Allah *(SWT)*. Furthermore, in order that there comes forth no mistake and a person does not erroneously thinks that Allah *(SWT)* discriminates unjustly in this raising up in degrees; it is declared that He *(SWT)* is aware of the degrees that He *(SWT)* gives, as He *(SWT)* is the Omniscient and Omnipotent.

It is important for us to understand that a monotheist, who stands against the perversions of the society by proofs and reasoning, deserves elevations. Finally, it is also imperative for us to understand that the degrees (of loftiness) are all according to Divine Will and given Wisely by Allah *(SWT)*.

Verse 84

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"And We gave to him [i.e., Abraham] Isaac and Jacob – all [of them] We guided. And Noah, We guided before; and among his descendants, David and Solomon and Job and Joseph and Moses and Aaron. Thus do We reward the doers of good."

In this verse, a part of the favours that Allah *(SWT)* had bestowed upon Prophet Abraham *(AS)* are referred to. Those favours are righteous off springs, and an eligible and fruitful family which is one of the greatest Divine merits.

Allah *(SWT)* mentions the favour on Prophet Abraham *(AS)* of bestowing righteous issues, such as Prophets Ishaq *(AS)* and Yaqoub *(AS)* in the beginning of the verse. Then, it is declared that the honour of these two Prophets *(AS)* does not lie only in the matter that they *(AS)* were the progenies of the Prophet Abraham *(AS)*, but that they *(AS)* themselves had fixed the light of guidance in their hearts *(AS)* by earnest thoughts and righteous deeds, with the Will of Allah *(SWT)*.

Next to this meaning, in order that nobody imagines that there had not been any advocator (Prophets *AS*) for monotheism during the periods before Prophet Abraham *(AS)*, and that this matter begun with the Prophethood of Abraham *(AS)*, the verse continues by elucidating that the same message of monotheism had been delivered by Prophet Noah *(AS)*, who is one of Prophet Abraham's *(AS)* ancestors. Furthermore, the verse mentions a group of the Prophets *(AS)* of Allah *(SWT)* who were from among the descendants of Prophet Abraham *(AS)* and his *(AS)* off springs, thus expounding the lofty position and rank of Prophet Abraham *(AS)* from the viewpoint of 'heritage and nobility', 'lineage' and 'the fruit' of his *(AS)* personality. The verse mentions several (but not all) Prophets *(AS)* who were from the seed of Prophet Abraham *(AS)*, including the Prophets Dawud *(AS)*, Suleiman *(AS)*, Yaqoub *(AS)*, Yusuf *(AS)*, Musa *(AS)* and Haroon *(AS)*.

Thus, the Qur'an makes it clear that their lofty rank and esteemed position existed as a result of Allah's *(SWT)* Will and their *(AS)* own righteous deeds.

Verses 85 through 87

Verses 85 through 87 of the Surah address a single theme and subject matter and it is advisable to understand the exposition of these verses simultaneously.

Verse 85

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿۸۵﴾

"And Zechariah and John and Jesus and Elias – and all were of the righteous."

Verse 86

وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَالۡيَسَعَ وَيُوۡنُسَ وَلُوۡطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۸۶﴾

"And Ishmael and Elisha and Jonah and Lot – and all [of them] We preferred over the worlds."

Verse 87

وَمِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ وَاِخۡوَانِهِمۡ ۚ وَاجۡتَبَيۡنٰهُمۡ وَهَدَيۡنٰهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۸۷﴾

"And [some] among their fathers and their descendants and their brothers – and We chose them and We guided them to a straight path."

Following the previous names of prophets *(AS)* mentioned in verse 84, the Qur'an refers to the names of some other prophets *(AS)* and their sublime attributes in this section of verses (verses 85 through 87).

The essence of the first two verses (85 and 86) is that the ranks of these Prophets (Zakariya *AS*, Yahya *AS*, Esa *AS*, Elias *AS*, Ismail *AS*, Elyasa *AS*, Yunus *AS* and Lut *AS*) were not given just for ceremonial reasons, but Allah *(SWT)* chose and preferred them *(AS)* to other people as He *(SWT)* Willed in His *(SWT)* Infinite Wisdom, due to their *(AS)* righteousness , faith and the loyalty to Allah *(SWT)* alone.

The third verse (verse 87) contains a general hint to the fathers, children and brothers of the above-mentioned prophets, whose names have not been referred to in details, yet the criteria for their lofty degrees and preference were the same as the other chosen prophets *(AS)* of Allah *(SWT)*.

Verse 88

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۸﴾

"That is the guidance of Allah by which He guides whomever He wills of His servants. But if they had associated others with Allah, then worthless for them would be whatever they were doing."

The verse states emphatically that Allah *(SWT)* choses and prefers His *(SWT)* Prophets *(AS)* to other people as He *(SWT)* Wills in His *(SWT)* Infinite Wisdom, and due to their *(AS)* righteousness, faith, and

loyalty to Allah *(SWT)* alone. Others (such as the disbelievers, the pagans and the polytheists) who ascribe partners to Allah *(SWT)* achieve nothing. Some of those pagans and polytheists might perhaps have earned places in the rogues' gallery of history as either ruthless conquerors or monuments to greed. But because they did not shun polytheism and did not adhere to exclusive and unadulterated devotion to Allah *(SWT)* alone, they could never have the honour of becoming the source of light and guidance to others nor would they be able to assume the leadership of the pious and the God-fearing. The verse states that even the 'good worldly deeds' that these disbelievers did would be of no avail to them in the Hereafter because they did not shun disbelief and polytheism.

Verse 89

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾

"Those are the ones to whom We gave the Scripture and Authority and Prophethood. But if they [i.e., the disbelievers] deny it, then We have entrusted it to a people who are not therein disbelievers."

In this verse the Prophets (AS) are mentioned as having been endowed with three things:

First, the revealed guidance embodied in the Book;

Second, *Hukm*, i.e. the correct understanding of the revealed guidance, the ability to apply its principles to the practical affairs of life, the God-given capacity to arrive at right opinions regarding human problems; and

Third, the Station of Prophethood, the office by virtue of which they *(AS)* are enabled to lead human beings in the light of the guidance vouchsafed to them *(AS)* by Allah *(SWT)*.

The verse further elaborates that Allah *(SWT)* does not care if the unbelievers and polytheists choose to reject the guidance which has come down from Him *(SWT)*, for He *(SWT)* had already raised a sizeable group of men of faith to truly appreciate its worth.

Verse 90

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ﴿٩٠﴾

"Those are the ones whom Allah has guided, so from their guidance take an example. Say, "I ask of you for it [i.e., this message] no payment. It is not but a reminder for the worlds."

This verse introduces the mission of the Prophets *(AS)*, which is, to spread the guidance bestowed upon them by Allah *(SWT)* and declares that their guidance from Allah *(SWT)* is a shining example to emulate. The verse then commands the Holy Prophet *(SAAW)* to tell the disbelievers that he *(SAAW)* is the most exalted example of guidance for all.

This verse implies that the principles of the invitation of all divine Prophets (AS) are the same, although the latter religions are more complete than the former religions.

The Arabic term *"hidayah"* conveys a vast meaning which encompasses both unity with other theological principles of Islam, and patience and perseverance, and all principles of morality and education espoused by Islam.

Finally, the Messenger *(SAAW)* of Allah *(SWT)* is ordered to tell people that he *(SAAW)* asks them no wage for his *(SAAW)* messengership, just like the former messengers *(AS)* did not ask such a thing.

Moreover, it follows rationally that the Qur'an and the Messenger ship of Muhammad *(SAAW)* is a warning and a reminder to all people throughout the world in all ages till the Hour.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الاَنام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- صفحات: 240
- قیمت: 180 روپے

خود مطالعہ کیجیے
دوستوں کو تحفتاً پیش کیجیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-03
فیکس: (042)35834000 ای میل: maktaba@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

Quarterly
Oct - Dec 2019
HIKMAT-E-QURAN
Lahore
Vol. 38 No. 4

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ